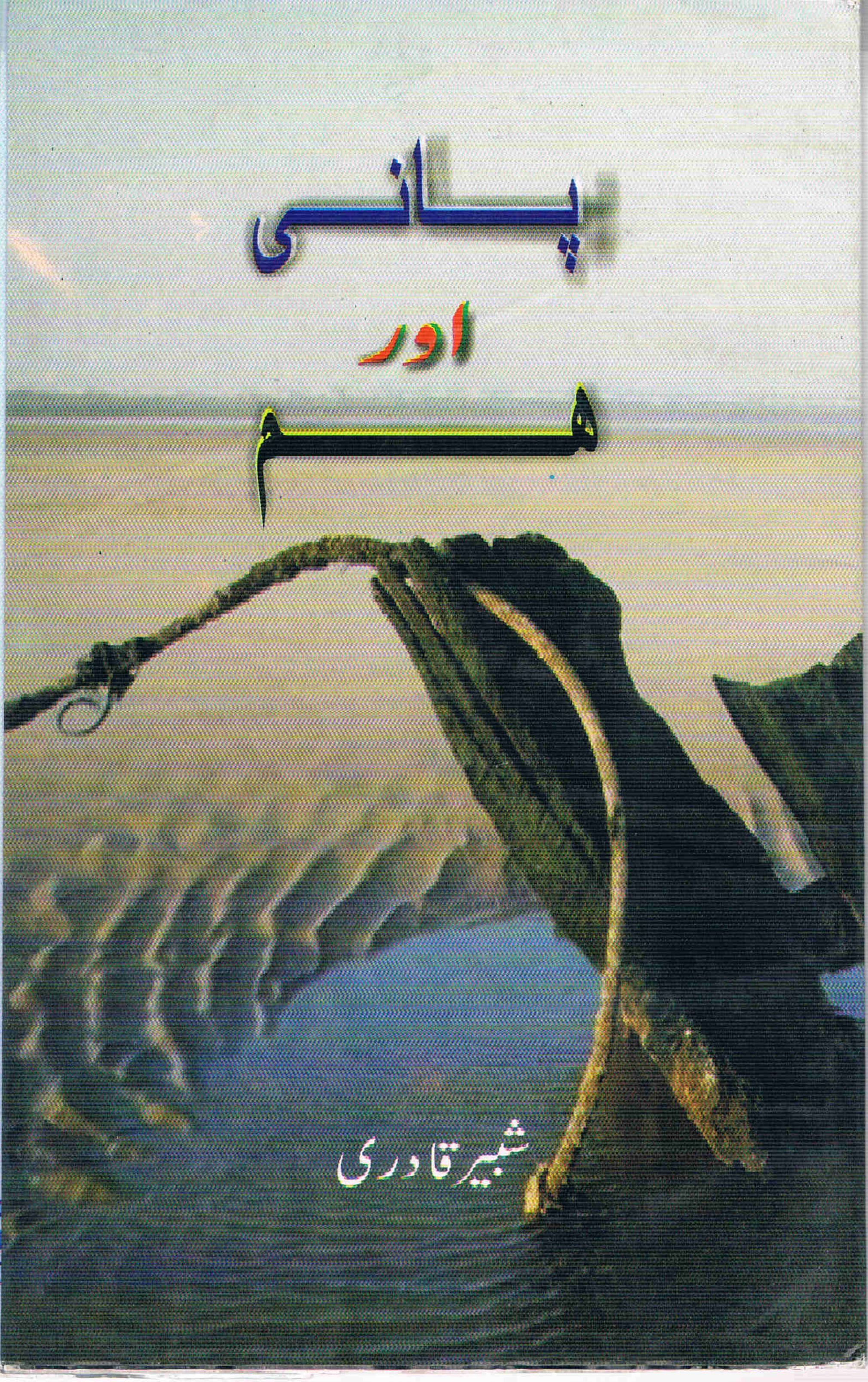
پانی
اور
ہم
شبیر قادری

URDU
TRANSLATION

BY

SHABBIR QADRI

THE BOOKS OF

NOTED ENVIORONMENTALIST

ANUPAM MISHRA

AAJ BHI KHARE
HAIN TALAB
&
GOCHAR KA
PRASAD BAANT TA
LAPODIA

AS

PAANI AUR HUM

پانی

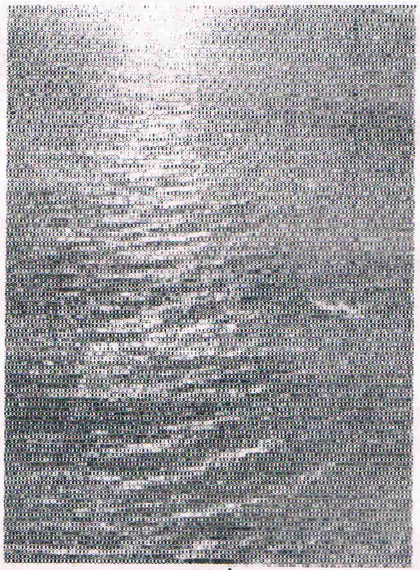

اور

ہم

شبیر قادری

آج بھی کھرے ہیں تالاب
گوچر کا پرساد بانٹتا لاپوڑیا

انوپم مشر

ترجمہ نگار

شبیر قادری

اشاعت اوّل : جنوری ۲۰۰۷ء

تعداد : ۵۰۰

قیمت :

ملنے کا پتہ : شبیر قادری، ایڈیٹر نیچر ٹوڈے، ۱۱ گلی کلو بوا، ریت گھاٹ، بھوپال فون:2530300

ناشر : شبیر قادری، ایڈیٹر نیچر ٹوڈے، ۱۱ گلی کلو بوا، ریت گھاٹ، بھوپال نے جوہی پبلی کیشنس کے بیغر سے کھرے پرنٹرس اور گرافکس کے تئیں درگا چوک تلیا، بھوپال سے چھپوا کر ۱۱ گلی کلو بوا، ریت گھاٹ، بھوپال سے شائع کیا۔

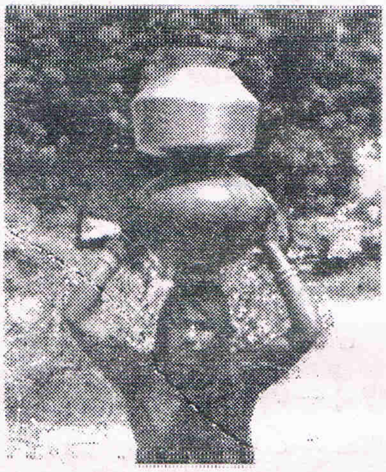

رحیمن پانی راکھیے.....

قریب چار سو سال پہلے کی بات ہے، جب مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانہ میں کوی عبدالرحیم خان خانہ نے برہانپور کی صوبیداری سنبھالتے ہوئے ایک انوکھے پانی تقسیم کے طریقہ کو انجام دیا تھا۔ یہ طریقہ ایران اور عراق میں مدھیہ کال سے ہی چلن میں تھا۔ جسے ''قنات'' کہا جاتا تھا۔ صرف پینے کا پانی ہی نہیں، دور دور تک سنچائی کا انتظام بھی اسی طریقہ سے آج بھی ہوتا آرہا ہے۔ جہانگیر کے زمانہ میں بُرہانپور کے پاس بہادر پور کا علاقہ کاروبار کا خاص مرکز بھی تھا اور فوجیں یہاں اپنا ڈیرا ڈالتی تھیں۔ کوی رحیم نے ان سب کی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے پانی تقسیم کا طریقہ ایجاد کیا تھا جو زمین کے اندر کے پانی کو عام شہریوں تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوئی۔ ٹوٹ پھوٹ جانے کے بعد یہ آج بھی قائم ہے۔

جو معاشرہ اپنے جغرافیائی حالات کی وجہ سے صدیوں سے کم سے کم پانی میں اپنا کام چلاتے آئے اور اسے سنجوتے بھی آئے ہیں، وہ ہی پوری طور پر پانی کی قیمت کو بھی پہچانتے رہے ہیں، تبھی تو مانڈو کی رانی روپ متی اور باز بہادر کے پیار کے بیچ نرمدا کی دھارا بہتی ہے۔ بھوپال کے اسلام نگر کے پانی کا انتظام بھی قابل تعریف ہے۔ خوبصورت نقاشیدار باوڑیوں میں اترتی سیڑھیوں کے بیچ ہمارا پانی صدیوں سے رہتا آیا ہے۔ یہ سیڑھیاں دھیرے دھیرے ٹوٹتی چلی گئی ہیں۔ جو معاشرہ پانی کے ان خوبصورت گھروں کو بنایا کرتا تھا، کوی رحیم ایسے ہی معاشرہ کے ایک دل خوش نمائندہ تھے اور دور بہنے والی تاپتی ندی کے پانی کو بنا کسی باہری طاقت کے برہانپور کے عوام کی پیاس بجھانے اس تک کھینچ لائے۔ کوی رحیم ہی تو ہم سے کہہ گئے ہیں کہ:

رحیمن پانی راکھیے بن پانی سب سون
پانی گئے نہ اوبرے موتی مانس چون

بھائی شبیر قادری نے بڑے ہی پیار سے پانی سے سچی چاہ جگانے کے لیے ''پانی اور ہم'' نام کی اس کتاب کو اردو زبان میں سنجویا ہے۔ اس کتاب میں ملک کے سارے تالابوں کی زندگی اور ان کے بننے مٹنے کی کہانی اور راجستھان کے ایک گاؤں لاپوڑیا کو پھر سے ہرا بھرا بنانے کے جذبے کے بارے میں بھارت کے جل پروش انوپم مشر کے جذبات پیش کیے گئے ہیں۔ انہیں کے ساتھ پانی کی اہمیت کو لیکر کچھ دوستوں کے خیالات بھی جوڑے گئے ہیں۔

آج دنیا پانی کی قلت سے پریشان ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آگے بھی یہ پریشانی بڑھتی جائے گی۔ یہ پریشانی کم ہو سکے، اس کے لیے اس کتاب میں جمع کیے گئے خیالات اُن سب لوگوں کے کام کے ہیں، جو زمین پر اور زمین کے اندر پانی کے خزانوں کو اپنے لیے، آنے والی قوموں کے لیے بچا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم سب پانی کی برادری کے ہی تو ہیں، پانی بچے گا تبھی ہماری برادری بھی بچے گی۔

دھرووشُکل
کوی۔ کتھاکار

پیش لفظ

موسم کی زبردست تبدیلیاں پوری دنیا پر اپنے اثرات چھوڑ رہی ہیں کیوں کہ انسان کے لیے بنائے گئے قدرتی انعامات ایک ایک کر دھیرے دھیرے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ انھیں انعامات میں سے ایک ہے پانی۔ جس کی کمی کی آواز ہمیں ملک کے ہر صوبے اور ہر شہر سے سبھی موسم میں تو صاف سنائی دیتی ہی ہے کم و بیش دنیا کے دیگر ممالک بھی ان دنوں پانی کے بحران سے دوچار ہیں۔ پانی کی کمی اگر صرف قدرتی موسم کی بد مزاجی کا اثر ہے تو اس میں ہماری بدکارگزاری بھی شامل ہے۔ جس بے ترتیبی سے ہم نے زمین کے پانی کو نکال کر اسے مالِ مفت اور دلِ بے رحم کی شکل دی ہے اور گاؤں یا شہروں میں موجود پرانے تالاب اور کنوں کو ختم کر ان کا وجود مٹا دیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک کے کئی صوبوں میں پانی کی قلّت عام دنوں میں بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔ گاؤں کے چھوٹے کسان اور مزدور روزانہ بڑی تعداد میں گاؤں سے روزگار کی تلاش میں شہر کا رُخ کر رہے ہیں، نتیجتاً شہر کے لیے بنائی گئی اسکیمیں بھی بڑھتی آبادی کی وجہ سے بے اثر ثابت ہو رہی ہیں۔ صرف پانی ہی وہ شے ہے جس کی بھرپور دستیابی نہ صرف غربت اور بے روزگاری کو ختم کر سکتی ہے بلکہ ترقی اور خوشحالی کا راستہ بھی بتاتی ہے۔ مشہور ماہرِ ماحولیات جناب انوپم مشر نے یوں تو کئی کتابیں لکھی ہیں، مگر پانی بچانے اور اپنی پرانی تہذیب کو زندہ رکھ کر کنوں، تالابوں اور پانی کے دیگر وسائل کو دوبارہ زندہ کرنے کے نسخے

بتانے اور دنیا بھر میں تہلکہ مچانے والی ان کی مختصر کتاب ''آج بھی کھرے ہیں تالاب'' جسے نئی دہلی کے گاندھی شانتی پرتشٹھان نے شائع کیا ہے اور راجستھان کے جودھ پور کے پاس کے ایک معمولی سے گاؤں پر منحصر ان کی ایک دیگر کتاب ''گوچر کا پرساد بانٹتا لاپوڑیا'' جسے میگیسیے ایوارڈ سے نوازے گئے مشہور ماہر ماحولیات اور پانی بچانے میں ملک بھر کا دورہ کر رہے نوجوان ساتھی راجندر سنگھ کی تنظیم گرام وکاس نو یووک منڈل لاپوڑیا جیپور نے شائع کیا ہے نے انوپم مشر کو پورے ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہ صرف لوگوں کے دلوں میں جگہ دی ہے بلکہ بنجر ہوتی اور اکال میں تبدیل ہوتی زمین کو ہرا بھرا بنانے اور لگ بھگ سوکھ گئے تالابوں اور کنوں کو پانی سے لبریز کر چھلچھلانے پر مجبور کیا ہے۔ انہیں کتابوں کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کے کئی صوبے اور شہر جہاں پانی کے زخیرے میدان میں تبدیل ہو گئے تھے، آج پھر ان میں پانی کی لہریں ہلورے مار رہی ہیں۔ انہیں کتابوں کو پڑھ کر کشمیر سے کنیا کماری تک عام سے لیکر خاص لوگوں نے پانی بچانے کا عزم تو لیا ہی کنوں اور تالابوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی مہم بھی چھیڑ دی ہے۔ اس مہم کے بیحد مفید اثرات اور نتیجے بار بار خوشحالی اور ترقی کی شکل میں ملک کے کئی شہروں میں لگاتار ظاہر ہو رہے ہیں۔ اسلئے میں نے ضروری سمجھا کہ ایسی کتابوں کو مسلم معاشرہ کے لوگ یا اردو کے جانکار بھی پڑھیں تاکہ ان میں بھی پانی کے دَم توڑتے وسائل کو دوبارہ زندہ کرنے کا شوق اور جذبہ پیدا ہو۔

پانی بچانے کی پرانی تہذیب کے سہارے ہم اپنے ملک کو کس طرح خوشحال، خود کفیل بنا کر مجبور معاشرہ کو دوبارہ مضبوط بنا سکتے ہیں۔ اس کی پُر اثر پیش کش کا راستہ بتاتی انوپم مشر کی یہ دو کتابیں 'آج بھی کھرے ہیں تالاب' اور 'گوچر کا پرساد بانٹتا لاپوڑیا' کا یوں تو کئی ہندوستانی اور بیرونی زبانوں میں تجربہ ہو چکا ہے اور اردو میں اس کا ترجمہ کرنے کی ہدایت اللہ نے مجھے عطا فرمائی ہے اس لیے میں اس نیک کارِ خیر کی بدولت اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اس کتاب کو پڑھ کر میرے معاشرہ میں بھی اللہ کی اس بیش قیمتی نعمت کو بچانے کا جذبہ ہر ایک مسلمان میں پیدا ہو۔ تاکہ آنے والی نسلیں اس سے فیضیاب ہوں۔ مجھے امید ہے کہ کتاب پڑھ کر پانی بچانے اور دَم توڑتے کنویں، تالابوں کو نئی شکل دینے کے کام کی طرف مسلمان بھی راغب ہونگے۔ میں

نے اس کتاب میں کچھ دوسرے لوگوں کے مضامین کا بھی ترجمہ کیا ہے جنہوں نے اپنے قلم سے پانی بچانے کی نئی روشنی دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری یہ کوشش جسے میں نے ''پانی اور ہم'' کا نام دیا ہے لوگوں میں ضرور بیداری پیدا کرا پنے مقصد میں کامیاب ہوگی۔ میں سب سے پہلے تخلیق کار جناب انوپم مشر کا تہِ دل سے مشکورہ ممنون ہوں جنہوں نے مجھے اس کا اردو ترجمہ کرنے کی بے ہچک اجازت دی۔ ہریانہ کے میرے دوست سریندر بانسل جنہوں نے اس کتاب کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے اور بھوپال کے کوی اور کتھا کار جناب دھرو وشکل کا بھی شکرگزار ہوں جنہوں نے مجھے اس کام کوانجام دینے کے لیے ہردم میرا ساتھ دیا اور جن کی وجہ سے ہی یہ کام ہو سکا۔ میری اس محنت میں ڈائرکٹریٹ آف پبلک ریلیشن کے سکریٹری جناب منوج شریواستو بھی شامل ہیں جنہوں نے اس کتاب کے ہندی ایڈیشن کو پڑھا ہے اور اس کے پُر اثر اندازِ بیاں کو سراہا ہے۔ میں ان کی ہر قدم پر کی گئی مدد کا شکرگزار ہوں۔ اسی طرح اس محکمہ کے ایڈیشنل ڈائرکٹر جناب این. کے. تواری اور جناب لاچیت آ کھوجا صاحب کا بھی مشکور اور ممنون ہوں جنہوں نے مجھے اس منزل تک پہنچانے کا راستہ دکھایا۔ میرے اس کام میں مشہور صحافی جناب رام ادھیر اور جناب اوم پرکاش کندرا نے بھی میری کافی حوصلہ افزائی کی ہے۔

مجھے امید ہے کہ اپنے مقصد میں میری یہ کوشش کامیاب ہوگی اور ہندوستان کے وہ بہت سارے کنویں اور تالاب جو اپنی بدحالی سے زار زار ہو تباہی کی شکل اختیار کر چکے ہیں دوبارہ پانی کے قیمتی زخائر سے لبریز ہو کر اس سرزمیں پر خوشحالی کا نیا پیغام لکھیں گے، اور نہ صرف اس طرح پینے کے پانی کی قلت دور ہوگی، کھیتی، باڑی اور چرند پرند بھی ہمارے ذریعہ بچائی گئی خدا کی اس نعمت سے فیضیاب ہو سکیں گے۔

شبیر قادری
ایڈیٹر ہندی ماہنامہ ''نیچر ٹڈ ے''
۱۱، گلی کلّو بوا، ریت گھاٹ، بھوپال
یکم جنوری عیدالضحیٰ ۲۰۰۷ء

اس کتاب میں

حصہ اوّل	:	آج بھی کھرے ہیں تالاب	صفحہ نمبر ۱۱
حصہ دوم	:	گوچر کا پرساد بانٹتا لاپوڑیا	صفحہ نمبر ۷۱
حصہ سوم	:	خصوصی مضامین	صفحہ نمبر ۹۷

سیتا باوڑی کا ایک اور نمونہ

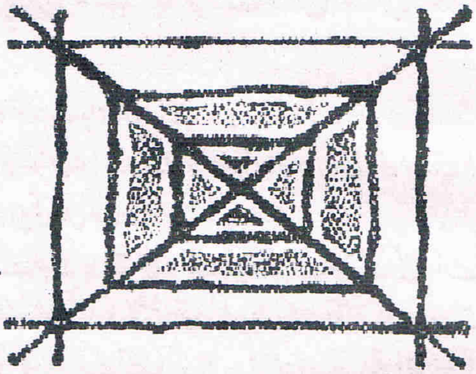

پال کے کنارے رکھی ہوئی تاریخ 12

بنیاد سے چوٹی تک 15

سنسار ساگر کے نایک 19

ساگر کے آگر 29

بے داغ پیشانی کا معاشرہ 38

ہزار نام 44

سراب کو جھٹلاتے تالاب 51

تالاب باندھتا مذہبی مزاج 61

آج بھی کھرے ہیں تالاب 66

پال کے کنارے رکھی ہوئی تاریخ

''اچھے اچھے کام کرتے جانا''، راجا نے کڑن سے کہا تھا۔

کڑن، بُڑھان، سرمن اور کونرائی تھے چار بھائی۔ چاروں صبح اُٹھ کر اپنے کھیت پر کام کرنے جاتے۔ دوپہر کو کڑن کی بیٹی آتی، پوٹلی میں کھانا لے کر۔

ایک دن گھر سے کھیت جاتے بیٹی کو ایک نکیلے پتھر سے ٹھوکر لگ گئی۔ اُسے بہت غصہ آیا۔ اُس نے اپنی درانتی سے اُس پتھر کو اُکھاڑنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی درانتی تو پتھر پر پڑتے ہی لوہے سے سونے میں بدل گئی اور پھر بدلتی جاتی ہیں اس لمبے قصے کی کڑیاں بڑی تیزی سے۔ پتھر اُٹھا کر لڑکی بھاگی بھاگی کھیت پر آتی ہے۔ اپنے والد اور چچاؤں کو سب کچھ ایک سانس میں بتا دیتی ہے۔ چاروں بھائیوں کی سانس بھی اٹک جاتی ہے۔ جلدی جلدی سب گھر لوٹتے ہیں۔ انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ اُن کے ہاتھ میں کوئی معمولی پتھر نہیں ہے، پارس ہے۔ وہ لوہے کی جس چیز کو چھوتے ہیں، وہ سونا بن کر ان کی آنکھوں میں چمک بھر دیتا ہے۔

لیکن آنکھوں کی یہ چمک زیادہ دیر تک نہیں ٹک پاتی۔ کڑن کو لگتا ہے کہ دیر سویر راجا تک یہ بات پہنچ ہی جائے گی اور تب پارس چھن جائے گا۔ تو کیا یہ زیادہ اچھا نہیں ہوگا کہ وہ خود جا کر راجا کو سب کچھ بتا دیں۔

قصہ آگے بڑھتا ہے۔ پھر جو کچھ واقع ہوتا ہے، وہ لوہے کو نہیں بلکہ سماج کو پارس سے چھوانے کا قصہ بن جاتا ہے۔

راجا نہ پارس لیتا ہے نہ سونا، سب کچھ کڑن کو واپس دیتے ہوئے کہتا ہے، ''جاؤ اس سے اچھے اچھے کام کرتے جانا، تالاب بناتے جانا۔''

یہ کہانی سچی ہے، تاریخی ہے- نہیں معلوم، لیکن ملک کے درمیانی علاقے میں اور بہت بڑے حصہ میں یہ تاریخ کو انگوٹھا دکھاتی ہوئی لوگوں کے دلوں میں بسی ہوئی ہے۔ یہاں کے پاٹن نامی علاقے میں چار بہت بڑے تالاب آج بھی ملتے ہیں اور اس کہانی کو تاریخ کی کسوٹی پر کسنے والوں کو لبھاتے ہیں- چاروں تالاب انہیں چاروں بھائیوں کے نام پر ہیں۔ بُڑھاگر میں بوڑھا ساگر ہے، مجھ گنواں میں سرمن ساگر ہے، کنواں گرام میں کونرائی ساگر ہے اور کنڈم گاؤں میں کنڈم ساگر۔ سن 1907ء میں گزیٹیر کے ذریعہ اس ملک کی منظم تاریخ لکھنے کے لیے دورہ کرنے والے انگریز نے بھی اس علاقے میں کئی لوگوں سے یہ قصہ سُنا تھا اور پھر دیکھا پرکھا تھا ان چاروں بڑے تالابوں کو۔ تب بھی سرمن ساگر اتنا بڑا تھا کہ اس کے کنارے تین بڑے

بڑے گاؤں بسے ہوئے تھے اور تینوں گاؤں اس تالاب کو اپنے اپنے ناموں سے بانٹ لیتے تھے۔ لیکن وہ بڑا تالاب تینوں گاؤں کو جوڑتا تھا اور سرمن ساگر کی طرح یاد کیا جاتا تھا۔ تاریخ نے سرمن، بُوھان، کونرائی اور کڑن کو یاد نہیں رکھا لیکن ان لوگوں نے تالاب بنائے اور تاریخ کو ان کے کنارے پر رکھ دیا تھا۔

ملک کے درمیانی حصہ میں، ٹھیک دل میں دھڑکنے والا یہ قصہ شمال - جنوب، مشرق - مغرب - چاروں طرف کسی نہ کسی شکل میں پھیلا ہوا مل سکتا ہے اور اسی کے ساتھ ملتے ہیں سینکڑوں تالاب۔ ان کی کوئی ٹھیک گنتی نہیں ہے۔ اِن اَن گنت تالابوں کو گننے والے نہیں، انہیں تو بنانے والے لوگ آتے رہے اور تالاب بنتے رہے۔

کسی تالاب کو راجا نے بنایا تو کسی کو رانی نے، کسی کو کسی معمولی گھریلو خاتون نے، بیوہ نے بنوایا تو کسی کو کسی غیر معمولی سادھو سنت نے، جس کسی نے بھی تالاب بنایا، وہ مہاراج یا مہاتما ہی کہلایا۔ ایک ہوشمند معاشرہ تالاب بنانے والوں کو جاوداں بناتا تھا اور لوگ بھی تالاب بنا کر معاشرے کے تئیں اپنی ہوشمندی کا اظہار کرتے تھے۔

معاشرہ اور اس کے افراد کے درمیان اس معاملہ میں ایک مناسب ہم آہنگی کا زمانہ کوئی چھوٹا دور نہیں تھا۔ ایک دم مہابھارت اور رامائن کے زمانے کے تالابوں کو ابھی چھوڑ دیں تو بھی کہا جاتا ہے کہ کوئی پانچویں صدی سے پندرہویں صدی تک ملک کے اس کونے سے اُس کونے تک تالاب بنتے ہی چلے آئے تھے۔ کوئی ایک ہزار سال تک نہ رکنے والی رفتار سے چلتی رہی اس روایت میں پندرہویں صدی کے بعد کچھ رکاوٹیں آنے لگی تھیں، لیکن اُس دور میں بھی یہ دھارا پوری طرح سے رُک نہیں پائی، سوکھ نہیں پائی۔ معاشرے نے جس کام کو اتنے لمبے عرصہ تک بہت منظّم شکل میں انجام دیا تھا، اُس کام کو اُتھل پتھل کا وہ دور بھی پوری طرح سے نہیں مٹا سکا، اٹھارہویں صدی کے آخر تک بھی جگہ جگہ تالاب بن رہے تھے۔

لیکن پھر بنانے والے لوگ دھیرے دھیرے کم ہوتے گئے۔ گننے والے کچھ ضرور آ گئے لیکن جتنا بڑا کام تھا، اُس تناسب سے گننے والے بہت ہی کم تھے اور کمزور بھی، اس لیے ٹھیک گنتی بھی کبھی ہو نہیں پائی۔ دھیرے دھیرے ٹکڑوں میں تالاب گنے گئے لیکن سب ٹکڑوں کی کل میزان کبھی نہیں لگائی گئی۔ لیکن ان ٹکڑوں کی جھلملاہٹ پوری اور مکمل تصویر کی چمک دکھا سکتی ہے۔

لبالب بھرے تالابوں کو سوکھے اعداد و شمار میں سمیٹنے کی کوشش کس کنارے سے شروع کریں؟ پھر سے ملک کے بیچ کے حصہ میں واپس لوٹیں۔

آج کے ریوا ضلع کا جوڑوری (जोड़ोरी) گاؤں ہے، کوئی 2500 کی آبادی کا، لیکن اس گاؤں میں 12 تالاب ہیں۔ اسی کے آس پاس ہے موکیدان (मुकेदान) تالاب، آبادی ہے بس کوئی 1500 کی، لیکن 10 تالاب ہیں گاؤں میں، ہر چیز کا اوسط نکالنے والوں کے لیے یہ چھوٹا سا گاؤں آج بھی 150 لوگوں پر ایک اچھے تالاب کی سہولت مہیا کرتا ہے۔ جس زمانے میں یہ تالاب بنے تھے، اُس دور میں آبادی بھی کم تھی، یعنی تب زور اس بات پر تھا کہ اپنے حصہ میں برسنے والی ہر ایک بوند اکٹھی کر لی جائے اور پریشانی کے وقت آس پاس کے علاقوں میں بھی اسے بانٹ لیا جائے۔ میکا ئیل کا تبرک گاؤں اپنی جھولی میں بھر لیتا تھا اور جہاں تبرک کم ملتا ہے؟ وہاں تو اس کا ایک ذرہ، ایک بوند بھی بھلا کیسے بکھرنے دی جا سکتی تھی۔ ملک میں سب سے کم بارش کے علاقے راجستھان اور اس میں بھی سب سے سوکھے مانے جانے والے تھار کے ریگستان میں بسے ہزاروں گاؤں کے نام ہی تالاب کی بنیاد پر ملتے ہیں۔ گاؤں کے نام کے ساتھ ہی جڑا ہے 'سر'۔ 'سر' یعنی تالاب۔ سر نہیں تو گاؤں کہاں؟ یہاں تو آپ تالاب گننے کے بدلے گاؤں ہی گنتے جائیں اور پھر اس جوڑ کو 2 یا 3 سے ضرب کر دیں۔ جہاں آبادی میں ضرب ہوا اور شہر بنا، وہاں بھی پانی نہ تو اُدھار لیا گیا، نہ آج کے شہروں کی طرح کہیں اور سے چُرا کر لایا گیا۔ شہروں نے بھی گاؤں کی طرح ہی اپنا انتظام خود کیا۔ دیگر شہروں کی بات بعد میں، ایک وقت کی دہلی میں کوئی 350 چھوٹے چھوٹے تالابوں کا ذکر ملتا ہے۔

گاؤں سے شہر، شہر سے صوبہ پر آئیں۔ پھر ریوا ریاست لوٹیں۔ آج کے معیار مطابق یہ پچھڑا علاقہ ہے۔ لیکن پانی کے انتظام کے لحاظ سے دیکھیں تو پچھلی صدی میں وہاں سب ملا کر کوئی 5000 تالاب تھے۔

نیچے جنوب کی ریاستوں کو دیکھیں تو آزادی ملنے سے کوئی سو برس پہلے تک مدراس پریسیڈنسی میں 53000 تالاب گنے گئے تھے۔ وہاں سن ۱۸۸۵ء میں صرف 14 ضلعوں میں کوئی 43000 تالابوں پر کام چل رہا تھا۔ اسی طرح میسور ریاست میں امیدوں کے نئے زمانے میں، سن ۱۹۸۰ء تک کوئی 39000 تالاب کسی نہ کسی شکل میں لوگوں کی خدمت کر رہے تھے۔ اِدھر اُدھر بکھرے یہ سارے اعداد و شمار ایک جگہ رکھ کر دیکھیں تو کہا جا سکتا ہے کہ اس صدی کی ابتدا تک اساڑھ کے پہلے دن سے بھادوں کے آخری دن تک کوئی 11 سے 12 لاکھ تالاب بھر جاتے تھے۔ اور اگلے جیٹھ تک میکا ئیل کا کچھ نہ کچھ تبرک بانٹتے رہتے تھے۔

کیونکہ لوگ اچھے اچھے کام کرتے جاتے تھے۔

☆☆

بنیاد سے چوٹی تک

آج اَن پوچھی گیارس ہے۔ دیواٹھ گئے ہیں۔ اب اچھے اچھے کام کرنے کے لئے کسی سے کچھ پوچھنے کی، مہورت نکلوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی سب لوگ مل جل رہے ہیں، سب سے پوچھ رہے ہیں، ایک نیا تالاب جو بننے والا ہے۔...

قارئین سوچیں گے کہ اب انہیں ایک تالاب کی تعمیر کی، پال بننے سے لے کر پانی بھرنے تک کی پوری تفصیل ملنے والی ہے۔ ہم خود ایسی تفصیل تلاش کرتے رہے ہیں لیکن ہمیں وہ کہیں نہیں ملی۔ جہاں صدیوں سے تالاب بنتے رہے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں بنے ہیں، وہاں تالاب بنانے کی پوری تفصیل نہ ہونا شروع میں غیر معمولی لگ سکتا ہے، لیکن یہی سب سے مناسب صورت حال ہے۔ 'تالاب کیسے بنائیں' کے بدلے چاروں طرف 'تالاب ایسے بنائیں' کا رواج تھا۔ پھر بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جوڑیں تو تالاب بنانے کی ایک خوبصورت نہ سہی کام چلاؤ تصویر تو سامنے آ ہی سکتی ہے۔

اُن پوچھی گیارس ہے۔ اب کیا پوچھنا ہے۔ ساری بات چیت تو پہلے ہی ہوچکی ہے۔ تالاب کی جگہ طے ہوچکی ہے، طے کرنے والوں کی آنکھوں میں نہ جانے کتنی 'برساتیں اتر چکی ہیں۔ اس لئے وہاں ایسے سوال نہیں اٹھتے کہ پانی کہاں سے آتا ہے، کتنا پانی آتا ہے، اس کا کتنا حصہ کہاں پر روکا جا سکتا ہے۔ یہ سوال نہیں ہے، باتیں ہیں سیدھی سادی، ان کی ہتھیلیوں پر رکھی ہیں، انہیں میں سے کچھ آنکھوں نے اس سے پہلے بھی کئی تالاب کھودے ہیں اور انہیں میں سے کچھ آنکھیں ایسی ہیں جو پیڑھیوں سے یہی کام کرتی آرہی ہیں۔

یوں تو دسوں سمتیں کھلی ہیں، تالاب بنانے کے لئے، پھر بھی جگہ کا انتخاب کرتے وقت کئی باتوں کا دھیان رکھا گیا ہے۔ گوچر (गोचर) کی طرف ہے یہ جگہ۔ ڈھال ہے، نچلا علاقہ ہے۔ جہاں سے پانی آئے گا، وہاں مُرم والی زمین ہے، اُس طرف رفع حاجت کے لئے بھی لوگ نہیں جاتے ہیں، مردہ جانوروں کی کھال وغیرہ نکالنے کی جگہ یعنی ہڑواڑا (हड़वाड़ा) بھی اِس طرف نہیں ہے۔

کام کرنے سے تجربہ بڑھتا ہے۔ تجربہ کار آنکھیں بات چیت میں سنی سنائی جگہ کو ایک بار دیکھ بھی لیتی ہیں۔ یہاں پہنچ کر آگور (आगौर)، جہاں سے پانی آئے گا، اُس کی صاف صفائی اور حفاظت کو یقینی بنا دیا جاتا ہے۔ آگر (आगार) (یعنی ریزوائر) جہاں پانی جمع ہوگا، اُس کے نوعیت کی جانچ کر لی جاتی ہے۔ پال کتنی اونچی ہوگی، کتنی چوڑی ہوگی، کہاں سے کہاں تک بندھے گی اور تالاب میں پانی پورا بھرنے پر اُسے بچانے کے

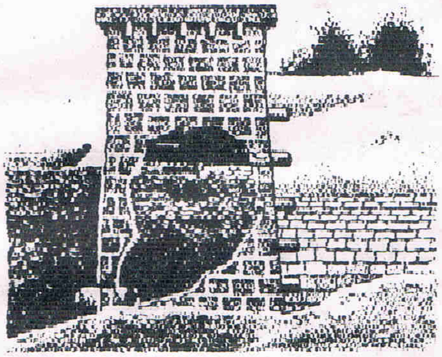

لئے کہاں پر اُپرا (अपरा) پشتہ بنے گا، اس کا بھی اندازہ کرلیا گیا ہے۔ سب لوگ اکھٹے ہوگئے ہیں، اب دیر کس بات کی۔ چمک دار تھالی سجی ہے، سورج کی کرنیں اُسے اور چمکا رہی ہیں، پانی سے بھرا لوٹا ہے، رولی، مولی، ہلدی، اکشت (چاول) کے ساتھ رکھا ہے لال مٹی کا ایک پاک ڈلا۔ زمین اور پانی کی پوجا کے اشلوک دھیرے دھیرے لہروں میں بدل رہے ہیں۔

وَرُون دیوتا کو یاد کیا جارہا ہے۔ تالاب کہیں بھی کھودا جارہا ہو، دیش کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کی ندیوں کو پکارا جارہا ہے۔ اشلوکوں کی لہریں تھمتی ہیں، مٹی میں پھاوڑوں کے ٹکرانے کی کھڑکھڑاہٹ سے۔ پانچ لوگ پانچ پرات مٹی کھودتے ہیں، دس ہاتھ پراتوں کو اٹھا کر پال پر ڈالتے ہیں، یہیں بندھے گی پال۔ گڑ تقسیم کیا جاتا ہے۔ مہورت کے مطابق ابتدا ہوگئی ہے۔ آنکھوں میں بسے ہوئے تالاب کا پورا نقشہ پھاوڑے سے نشان لگا کر زمین پر اُتار لیا گیا ہے۔ کہاں سے مٹی نکلے گی اور کہاں کہاں ڈالی جائے گی، پال سے کتنی دوری پر کھدائی ہوگی، تاکہ پال کے ٹھیک نیچے اتنی گہرائی نہ ہو جائے کہ پال پانی کے دباؤ سے کمزور ہونے لگے...

اُن پوچھی گیارس کو اتنا تو ہو ہی جاتا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے اُس دن کام شروع نہیں ہو پائے تو پھر مہورت پوچھا جاتا تھا، نہیں تو خود نکالا جاتا تھا۔ گاؤں اور شہر میں گھر گھر میں ملنے والے پنچانگ اور کئی باتوں کے ساتھ کنواں، باؤڑی اور تالاب بنانے کا مہورت آج بھی سمجھاتے ہیں: ''ہست، انورادھا، تینوں اُترا، شت بھشا، مگھا، روہنی، پھول، مرگ شرا، نچھتروں میں چندروار، بدھوار، جمعرات اور جمعہ کو کام شروع کریں۔ لیکن تاریخ چوتھی، نویں اور چودھویں کو چھوڑ دیں۔ نیک ساعتوں میں گرو اور بدھ بلی قربان ہو، پاپ گرہ کمزور ہو، جمعہ کا چاند برج حوت میں ہو یا چوتھی ہو، جمعرات جمعہ منحوس نہ ہوں تو کھودوانا سعد ہے۔''

آج ہم میں سے زیادہ لوگوں کو اس تفصیل میں سے دنوں کے کچھ نام ہی سمجھ میں آسکیں گے، لیکن آج بھی سماج کے ایک بڑے طبقے کے ذہن کی گھڑی اسی گھڑی سے مطابقت رکھتی ہے۔ کچھ پہلے تک تو پورا معاشرہ اسی گھڑی سے چلتا تھا۔ ...گھڑی سادھ لی گئی ہے۔ لوگ واپس لوٹ رہے ہیں، اب ایک دو دن بعد

جب بھی سب کو آسانی ہوگی، پھر سے کام شروع ہوگا۔ تجربہ کار نگاہیں اس دوران پلک نہیں جھپکاتیں۔ کتنا بڑا ہے تالاب، کام کتنا ہے، کتنے لوگ لگیں گے، کتنے اوزار، کتنے من مٹی کھودی جائے گی، پال پر کیسے ڈالی جائے گی مٹی؟ تسلوں سے، بہنگی، لڈّنے سے ڈھوئی جائے گی یا گدھوں کی بھی ضرورت پڑے گی؟ سوال لہروں کی طرح اٹھتے ہیں۔ کتنا کام کچا ہے، مٹی کا، کتنا پکا چونے کا، پتھر کا۔ مٹی کا کچا کام بالکل پکا کرنا ہے اور پتھر، چونے کا پکا کام کچا نہ رہ جائے۔ سوالوں کی لہریں اٹھتی ہیں اور تجربہ کار ذہن کی گہرائی میں محو ہوتی جاتی ہیں۔ سیکڑوں من مٹی کا بےحد وزنی کام ہے۔ بہتے پانی کو روکنا ہے، ہاں یہ کام آگ سے کھیلنا ہے۔

ڈگڈگی بجتی ہے، پورا گاؤں تالاب کی جگہ پر جمع ہوتا ہے، تالاب پر کام امانی میں چلتا ہے، امانی یعنی سب لوگ ایک ساتھ کام پر آئیں گے، ایک ساتھ واپس گھر لوٹیں گے، سینکڑوں ہاتھ مٹی کاٹتے ہیں، سینکڑوں ہاتھ پال پر مٹی ڈالتے ہیں۔ دھیرے دھیرے پہلا آثار پورا ہوتا ہے، ایک سطح اُبھر کر دکھائی دیتی ہے، پھر اُس کی دبائی شروع ہوتی ہے، دبانے کا کام نندی کر رہے ہیں، چار نکیلے کھروں پر بیل کا پورا وزن پڑتا ہے، پہلا آثار پورا ہوا تو اُس پر مٹی کی دوسری تہہ ڈلنی شروع ہوتی ہے، ہر ایک آثار پر پانی سینچتے ہیں، بیل چلاتے ہیں، سینکڑوں ہاتھ تیزی سے چلتے رہتے ہیں، آثار بہت اطمینان کے ساتھ دھیرے دھیرے اُٹھتے جاتے ہیں۔

اب تک جو کدال کی ایک دھندلی لکیر تھی، اب وہ مٹی کی پٹی بن گئی ہے۔ کہیں یہ بالکل سیدھی ہے تو کہیں یہ بل کھا رہی ہے، آگور سے آنے والا پانی جہاں پال پر زوردار طاقت آزما سکتا ہے، وہیں پر پال کو بھی مضبوط کیا گیا ہے۔ اِسے ''کہنی'' بھی کہتے ہیں۔ پال یہاں ٹھیک ہماری کہنی کی طرح مڑ جاتی ہے۔

جگہ گاؤں کے پاس ہی ہے تو کھانا کھانے کے لئے لوگ گھر جاتے ہیں، جگہ دور ہوئی تو کھانا بھی وہیں پر ہوتا ہے، لیکن پورے دن گڑ کا میٹھا پانی سب کو وہیں ملتا ہے، پانی کا کام پیار و محبت کا ہے، ثواب کا کام ہے، اس میں امرت جیسا میٹھا پانی ہی پلانا ہے، تبھی امرت جیسا سرور یعنی تالاب بنے گا۔ اس امرتسر کی حفاظت کرے گی پال، وہ تالاب کی پالک ہے، پال نیچے کتنی چوڑی ہوگی، کتنی اوپر اٹھے گی، اوپر کی چوڑائی کتنی ہوگی، ایسے سوالات ریاضی یا سائنس کا بوجھ نہیں بڑھاتے، ماہر آنکھوں کا آسان حساب کوئی جاننا ہی چاہے تو اونچائی بنیاد کی چوڑائی سے آدھی ہوگی اور پوری بن جانے پر اوپر کی چوڑائی اونچائی سے آدھی ہوگی۔

مٹی کا کچا کام پورا ہو چکا ہے، اب پکے کام کی باری ہے، چنکروں نے چونے کو بجھا لیا ہے، گرٹ لگ گئی ہے، اب گارا تیار ہو رہا ہے، سلاوٹ پتھر کی کٹائی میں مصروف ہو گئے ہیں، حفاظت کرنے والی پال کی بھی حفاظت کرنے کے لئے نیشٹا Waste ware بنایا جائے گا۔ نیشٹا یعنی وہ جگہ جہاں سے تالاب کا فاضل پانی پال کو نقصان پہنچائے بغیر بہہ جائے گا۔ کبھی یہ لفظ ''نسرشٹ'' یا ''نسترن'' یا ''نستار'' رہا ہوگا۔

تالاب بنانے والوں کی زبان سے کٹتے کٹتے یہ گھس کر ''نیشٹا'' کی شکل میں اتنا مضبوط ہوگیا کہ پچھلے سیکڑوں سالوں سے اس کی ایک بھی ماترا ٹوٹ نہیں پائی ہے۔

نیشٹا پال کی اونچائی سے تھوڑا نیچا ہوگا، تبھی تو پال کو توڑنے سے پہلے ہی پانی کو بہا سکے گا۔ زمین سے اس کی اونچائی پال کی اونچائی کے تناسب میں طے ہوگی۔ تناسب ہوگا کوئی 10 اور 7 ہاتھ کا۔

پال اور نیشٹا کا کام پورا ہوا اور اس طرح بن گیا تالاب کا آگر۔ آگور کا سارا پانی آگر میں سمٹ کر آئے گا۔ تجربہ کار آنکھیں ایک بار پھر آگور اور آگر کو تول کر دیکھ لیتی ہیں۔ آگر کی گنجائش آگور سے آنے والے پانی سے کہیں زیادہ تو نہیں، کم تو نہیں۔ جواب 'ہاں' میں نہیں آتا۔

آخری مرتبہ ڈگڈگی پٹ رہی ہے۔ کام تو پورا ہوگیا ہے لیکن آج پھر سبھی لوگ اکھٹے ہوں گے، تالاب کی پال پر۔ ان پوچھی گیارس کو جو عہد کیا تھا وہ آج پورا ہوگیا۔ بس آگور میں ستون لگانا اور پال پر گھٹونیا دیوتا کی مورتی نصب ہونا باقی ہے۔ آگر کے ستون پر گنیش جی براجے ہیں اور نیچے ہیں سرپ راج۔ گھٹونیا بابا گھاٹ پر بیٹھ کر پورے تالاب کی حفاظت کریں گے۔

آج سب کی دعوت ہوگی۔ خوبصورت مضبوط پال سے گھرا تالاب دور سے ایک بڑی تھالی کی طرح لگ رہا ہے۔ جن بے نام لوگوں نے اسے بنایا ہے، آج وہ تبرک تقسیم کر کے اسے ایک خوبصورت سا نام بھی دیں گے اور یہ نام کسی کاغذ پر نہیں، لوگوں کے دل پر لکھا جائے گا۔

لیکن نام کے ساتھ کام ختم نہیں ہوا، جیسے ہی ہتھیا پچھتر اُگے گا، پانی کا پہلا جھلا گرے گا، سب لوگ پھر تالاب پر جمع ہوں گے۔ تجربہ کار آنکھوں کا امتحان آج ہی تو ہوگا۔ لوگ کدال، پھاوڑے، بانس اور لاٹھی لے کر پال پر گھوم رہے ہیں، خوب ہوشیاری سے ایک ایک آثار اُٹھی پال بھی پہلے جھلے کا پانی پیے بغیر مضبوط نہیں ہوگی، ہر کہیں سے پانی بیٹھ سکتا ہے، دراریں پڑ سکتی ہیں، چوہوں کے بل بننے میں بھی کتنی دیر لگتی ہے بھلا! پال پر چلتے ہوئے لوگ بانسوں اور لاٹھیوں سے ان سوراخوں کو دبا دبا کر بند کر رہے ہیں۔ کل جس طرح پال دھیرے دھیرے اُٹھ رہی تھی، آج اُسی طرح آگر میں پانی اُٹھ رہا ہے، آج وہ پورے آگور سے سمٹ سمٹ کر آرہا ہے:

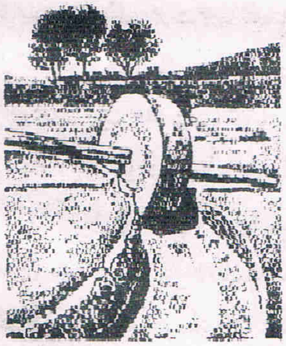

سمٹ سمٹ جل بھرہن تلاوا
جمی سدگن سجن پہن آوا

بے نام ہاتھوں کی انسانی قوت پانی نے تسلیم کرلی ہے۔ ☆☆

سنسار ساگر کے نایک

کون تھے بے نام لوگ؟

سینکڑوں ہزاروں تالاب اچانک صفر سے وجود میں نہیں آئے تھے۔ ان کے پیچھے ایک اکائی تھی بنوانے والوں کی، تو دہائی تھی بنانے والوں کی۔ یہ اکائی دہائی مل کر سینکڑوں ہزار بنتی تھی لیکن پچھلے 200 برسوں میں نئے قسم کی تھوڑی سی پڑھائی پڑھ گئے سماج نے اس اکائی دہائی سینکڑا، ہزار کو صفر ہی بنا دیا۔ اس نئے سماج کے ذہن میں اتنی بھی جستجو نہیں رہی کہ اس سے پہلے کے دور میں اتنے سارے تالاب بھلا کون بناتا تھا۔ اُس نے اس طرح کے کام کو کرنے کے لئے نیا ڈھانچہ کھڑا کیا ہے، آئی.آئی.ٹی. کا، سول انجینئرنگ کا، اُس پیمانے سے، اُس گز سے بھی اُس نے پہلے کیے جا چکے اس کام کو ناپنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

وہ اپنے گز سے بھی ناپتا تو کم از کم اُس کے ذہن میں ایسے سوال تو اٹھتے کہ اُس دور کی آئی.آئی.ٹی. کہاں تھی؟ کون تھے اُس کے ڈائریکٹر؟ کتنا بجٹ تھا، کتنے سول انجینئر نکلتے تھے؟ لیکن اُس نے اس سب کو گزرے ہوئے زمانے کا گیا بیتا کام مانا اور پانی کے سوال کو نئے ڈھنگ سے حل کرنے کا وعدہ کیا اور دعویٰ بھی۔ گاؤں، قصبوں کی تو کون کہے، بڑے شہروں کے نلوں میں چاہے جب پہنچنے والا سناٹا اس وعدے اور دعوے پر سب سے واضح اظہار خیال ہے۔ آج کے معاشرے کے دعووں کو اسی وقت کے پیمانے سے ناپیں تو کبھی دعوے چھوٹے پڑتے ہیں تو کبھی پیمانہ ہی چھوٹا نکل آتا ہے۔

اس پیمانے کو ابھی یہیں چھوڑیں اور تھوڑا پیچھے لوٹیں، آج جو بے نام ہو گئے، اُن کا ایک وقت میں بڑا نام تھا۔ پورے ملک میں تالاب بنتے تھے اور بنانے والے بھی پورے ملک میں تھے۔ کہیں یہ تعلیم برادری کے مدرسہ میں دی جاتی تھی تو کہیں یہ ذات سے ہٹ کر ایک خاص قبیلہ بھی بن جاتی تھی۔ بنانے والے لوگ کہیں ایک جگہ بسے ہوئے ملتے تھے تو کہیں یہ گھوم گھوم کر اس کام کو کرتے تھے۔

گج دھر ایک خوبصورت لفظ ہے، تالاب بنانے والوں کو عزت کے ساتھ یاد کرنے کے لئے۔ راجستھان کے کچھ علاقوں میں یہ لفظ آج بھی باقی ہے۔ گج دھر یعنی گج رکھنے والا اور گج (گز) وہی جو ناپنے کے کام آتا ہے۔ لیکن پھر بھی معاشرے نے انہیں تین ہاتھ کی لوہے کی چھڑ لے کر گھومنے والا مستری نہیں مانا۔ گج دھر جو سماج کی گہرائی کو ناپ لے۔ اُسے ایسا درجہ دیا گیا ہے۔

گج دھر معمار تھے۔ دیہی سماج ہو یا شہری معاشرہ، اُس تعمیر نو کی، رکھ رکھاؤ کی ذمہ داری گج دھر

نبھاتے تھے۔ شہری انتظامیہ سے لے کر چھوٹی تعمیر کے کام گج دھر کے ذمہ تھے۔ وہ منصوبہ بناتے تھے، کُل کام کی لاگت نکالتے تھے، کام میں لگنے والی ساری اشیاء جمع کرتے تھے اور اس سب کے بدلے وہ اپنی محترم شخصیات سے ایسا کچھ نہیں مانگ بیٹھتے تھے، جو لوگ دے نہ پائیں، لوگ بھی ایسے تھے کہ اُن سے جو کچھ بنتا، وہ گج دھر کو عطیہ کر دیتے تھے۔

کام پورا ہونے پر مزدوری کے علاوہ گج دھر کو سامان بھی ملتا تھا۔ سروپا پیش کرنا اب شاید صرف سکھ روایت میں ہی باقی ہے لیکن ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تک راجستھان میں گج دھر کو مالک مکان کی جانب سے بہت احترام کے ساتھ سروپا پیش کیا جاتا رہا ہے۔ پگڑی باندھنے کے علاوہ چاندی اور کبھی کبھی سونے کے بٹن بھی پیش کیے جاتے تھے۔ زمین بھی ان کے نام کی جاتی تھی۔ پگڑی پہنائے جانے کے بعد گج دھر اپنے ساتھ کام کرنے والی جماعت کے کچھ اور لوگوں کا نام بتاتے تھے، انہیں بھی اجرت کے علاوہ حسب حیثیت کچھ نہ کچھ پیش کیا جاتا تھا۔ احسان مندی کا یہ جذبہ تالاب بننے کے بعد ہونے والی دعوت میں خاص طور سے دیکھنے میں آتا تھا۔

گج دھر ہندو تھے اور بعد میں مسلمان بھی۔ سلاوٹ یا سلاوٹا نامی ایک برادری معماری میں بہت معروف ہوئی ہے۔ سلاوٹ لفظ شلا یعنی پتھر سے بنا ہے۔ سلاوٹا بھی گج دھر کی طرح دونوں مذہبوں میں تھے۔ آبادی کے تناسب میں ان کی تعداد کافی تھی۔ ان کے اپنے محلّے تھے، آج بھی راجستھان کے پرانے شہروں میں 'سلاوٹ پاڑا' مل جائیں گے۔ سندھ کے علاقے میں، کراچی میں بھی سلاوٹوں کا بھرا پُرا محلّہ ہے۔ گج دھر اور سلاوٹ - ایک ہی کام کرنے والے یہ دو نام کہیں کہیں ایک ہی ہو جاتے تھے۔ جیسلمیر اور سندھ میں سلاوٹوں کے نایک ہی گج دھر کہلاتے تھے۔ کراچی میں بھی انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستانی وزارت میں بھی ایک سلاوٹ - حاکم محمد گج دھر کی تعیناتی ہوئی تھی۔

ان کی ایک شاخ کا شجرہ تو مرنسل سے جا ملتا تھا اور وہ سماجی تعمیر کے سب سے اونچے عہدہ کو بھی چھوتی رہی ہے، اننگ پال تنور نے بھی کبھی دہلی پر جھنڈا لہرایا تھا۔

تجربہ کار آنکھوں کی خوبصورت مثال تھے گج دھر۔ گرو چیلے کی روایت سے کام سکھایا جاتا تھا۔ نئے کو پرانا ہاتھ اتنا سکھاتا، اتنا اٹھاتا کہ وہ کچھ عرصہ بعد 'جوڑیا' یعنی ساتھی بن جاتا۔ جوڑیا یعنی گج دھر کا معتمد ساتھی۔ ایک گج دھر کے ساتھ کئی جوڑیا ہوتے تھے۔ کچھ اچھے جوڑیوں والے گج دھر خود اتنے اوپر اٹھ جاتے تھے کہ بس پھر اُن کا نام ہی گج دھر رہ جاتا، لیکن گج (گز) ان کا چھوٹ جاتا۔ اچھے گج دھر کی ایک تعریف یہی تھی کہ وہ اوزاروں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ صرف جگہ دیکھ کر فیصلہ کرتے کہ کہاں کیا کرنا ہے، وہ ایک جگہ بیٹھ جاتے اور سارا

کام اُن کے زبانی حکم پر چلتا رہتا۔

اوزاروں کا استعمال کرتے کرتے اتنا اوپر اُٹھنا کہ پھر اُن کی ضرورت ہی نہیں رہے، یہ ایک بات ہے۔ لیکن کبھی اوزاروں کو ہاتھ ہی نہیں لگانا، یہ دوسری بات ہے۔ ایسے ہنرمند سربھاؤ (सिरभाव) کہلاتے تھے۔ سربھاؤ کسی بھی اوزار کے بغیر پانی کی ٹھیک جگہ بتاتے تھے۔ کہتے ہیں اُنہیں الہام ہوتا تھا، یعنی بس پتا چلتا جاتا تھا، سربھاؤ کوئی خاص برادری سے نہیں ہوتے تھے۔ بس کسی کسی کو یہ مہارت حاصل ہو جاتی تھی، جل سونگھا (जलसुंघा) یعنی زمینی پانی کو 'سونگھ' کر بتانے والے بھی سربھاؤ جیسے ہی ہوتے تھے لیکن وہ زیر زمین پانی کی لہروں کے اشارے کو آم یا جامن کی لکڑی کی مدد سے پکڑ کر پانی کا پتا بتاتے تھے۔ یہ کام آج بھی جاری ہے۔ ٹیوب ویل کھودنے والی کمپنیاں پہلے اپنے آلے سے جگہ کا انتخاب کرتی ہیں پھر انہیں بلاکر اور پکا کر لیتی ہیں کہ پانی ملے گا یا نہیں۔ سرکاری علاقوں میں بھی بغیر کاغذ پر دکھائے ان کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔

سلاوٹا شبد مدھیہ پردیش تک جاتے جاتے ایک ماترا کھوکر سلاوٹ بن جاتا ہے لیکن ہنرمندی جوں کی توں رہتی ہے۔ کہیں کہیں ملک کے وسط میں سلاکار بھی تھے، گجرات میں بھی ان کی اچھی آبادی ہے۔ وہاں یہ سلاٹ کہلاتے ہیں، ان میں ہیرا سلاٹ پتھر پر اپنے کام کی وجہ سے بہت ہی مشہور ہوئے ہیں۔

کچھ میں 'گج دھر' 'گردھر' ہو گئے اُن کا شجرو نسب اندر دیوتا کے بیٹے سے شروع ہوتا ہے۔ گردھر کا ایک نام 'سوتر دھار' بھی رہا ہے۔ یہی بعد میں گجرات میں ٹھار اور دیش کے کئی حصوں میں 'سوتھار' ہو گیا۔

گج دھروں کا ایک شاستری نام 'استھاپتی' (स्थपति) بھی تھا، جو تھروئی کی طرح آج بھی رائج ہے۔

پتھروٹ (पथरोट) اور ٹکاری (टकारी) بھی پتھر پر ہونے والے سبھی کاموں کے اچھے جانکار تھے اور تالاب بنانے کا کام بھی کرتے تھے۔ مدھیہ پردیش میں پتھروٹا نام کے گاؤں اور محلّے آج بھی ان کی یاد دلاتے ہیں۔ ٹکاری جنوب میں دور تک پھیلے ہوئے تھے اور ان کے محلّے ٹکیر واڑی کہلاتے تھے۔

یہ دنیا مٹی کی ہے اور اس مٹی کی پوری دنیا جاننے والوں کی کمی نہیں تھی۔ یہ مٹکوٹ تھے تو کہیں مٹکوڑا اور جہاں یہ بستے تھے وہ گاؤں مٹکولی کہلاتے تھے۔ سونکر اور سُنکر الفاظ سونے کا کام کرنے والوں کے لیے تھے۔ لیکن یہ سونا سونا نہیں، مٹی ہی تھا۔ سونکر یا سُنکر راج لہریا بھی کہلاتے تھے۔ یہ اپنے کو رگھوونشی کے سمراٹ سگر (सगर) کے بیٹے سے جوڑتے تھے۔ اُشومیگھ یگیہ کے لئے چھوڑے گئے گھوڑے کی چوری ہو جانے پر سگر بیٹوں نے اُس کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے ساری زمین کھود ڈالی تھی اور آخر میں کپل مُنی کے غصہ کے سزاوار بن بیٹھے تھے۔ اُسی بددعا کی وجہ سے سونکر تالابوں میں مٹی کھودنے کا کام کرتے تھے، لیکن اب عذاب نہیں، ثواب کماتے تھے۔ یہ اینٹ بنانے کے کام میں بھی بہت ماہر تھے۔ کھنتی (खन्ती) بھی تالاب کی مٹی کاٹنے کے کام

سماج کی گہرائی ناپتے رہے ہیں گج دھر

کے لئے بلائے جاتے تھے۔ جہاں یہ کسی وجہ سے نہ ہوں، وہاں کمہار سے تالاب کی مٹی کے بارے میں صلاح لی جاتی تھی۔

تالاب کی جگہ کا انتخاب کرتے وقت بُلئی (बुलई) بغیر بلائے آتے تھے۔ بلئی یعنی وہ جنہیں گاؤں کی پوری پوری معلومات رہتی تھی۔ کہاں کیسی زمین ہے، کس کی ہے، پہلے کہاں کہاں تالاب، باؤڑی وغیرہ بن چکے ہیں، کہیں اور بن سکتے ہیں، ایسی تمام معلومات بُلئی کو ازبر رہتی تھی، پھر اس کے پاس اس سب کا باریک حساب کتاب لکھا ہوا بھی ملتا تھا۔

مالوہ کے علاقے میں بلئی کی مدد سے ہی یہ سب معلومات رقبے میں باقاعدہ درج کی جاتی تھی اور یہ رقبہ ہر ایک زمینداری میں محفوظ رہتا تھا۔ مالوہ میں بلئی کو بلائی کہا جاتا ہے۔

بُلئی کہیں ڈھیر (ढेर) بھی کہلاتے تھے اور اسی طرح مردھا (मिर्धा) تھے، جو زمین کی پیمائش، حساب کتاب اور زمین کے جھگڑوں کا نبٹارا بھی کرتے تھے۔

اینٹ اور چونے کے گارے کا کام چُنکر (चुनकर) کرتے تھے۔ باقی وقت میں نمک کی بھی تجارت انہیں کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ آج کے مدھیہ پردیش میں ۱۹۱۱ء میں چنکروں کی آبادی 25,000 سے اوپر تھی۔ اُدھر اڑیسہ میں لُنیا، مُرہا اور سانسیا تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں سانسیوں کو جرائم پیشہ بتا کر پوری طرح منتشر کر دیا گیا تھا۔

نئے لوگ جس طرح تالابوں کو بھول گئے، اُسی طرح اُن کے بنانے والوں کو بھی۔ بھولے بسرے لوگوں کی فہرست میں لڈیا (लडिया)، دُساوھ (दुसाध)، نونیا، گونڈ، پردھان، کول، ڈھیمر (ढीमर)، ڈھیور (ढीवर) اور بھوئی بھی آتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب یہ تالاب کے اچھے جانکار مانے جاتے تھے۔ آج ان کی اُس حیثیت کو سمجھنے کا ریکارڈ بھی ہم کھو بیٹھے ہیں۔

کوری یا کولی ذات کے لوگوں نے بھی تالابوں کا بڑا کام کیا تھا۔ سینکڑوں تالاب بنانے والے کوریوں

کے بارے میں آج صحیح معلومات بہم پہنچانے والی ایک سطر بھی نہیں مل پاتی۔ لیکن ایک وقت تھا جب بہت سے علاقے کولی ذات کے لوگوں کو اپنے یہاں بسانے کے لئے کئی طرح کی آسانیاں فراہم کرتے تھے۔ مہاراشٹر، گجرات کے بہت سے گاؤں میں انہیں جو زمین دی جاتی تھی، اُس کا لگان معاف کر دیا جاتا تھا۔ ایسی زمین 'بارا' یا 'واری' کہلاتی تھی۔

سچ مچ مردانِ آہن تھے اگاریا (अगारिया)۔ یہ لوگ لوہے کا کام کرتے تھے۔ لیکن کہیں کہیں اگریا تالاب بھی بناتے تھے۔ تالاب کھودنے کے اوزار - گینتی، پھاوڑا، بیل، بیٹاک، تسلے یا تگاڑی بنانے والے لوگ اُن اوزاروں کو چلانے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ بیل سے ہی بیلدار لفظ بنا ہے۔

مالی سماج اور اس کام میں لگی پر یہار برادری کا بھی تالاب بنانے میں، تالاب بٹنے پر اُس میں کنول، کمودنی لگانے میں تعاون ہوتا تھا۔ کہیں کہیں تالاب کے کنارے کی کچھ زمین صرف مالی خاندانوں کے لئے محفوظ رکھی جاتی تھی۔ اُن کی گزر اوقات تالاب سے ہوتی تھی اور زندگی بھر وہ تالاب کی رکھوالی کرتے تھے۔

بھیل، بھلالے، سہریا (सहरिया)، کول آج اپنی شناخت کھو چکے ہیں اور درج فہرست قبائل میں شامل کر دیے گئے ہیں لیکن ایک زمانے میں ان کی چھوٹی بڑی ریاستیں تھی۔ ان ریاستوں میں یہ پانی کا، تالابوں کا پورا انتظام خود سنبھالتے تھے۔ بہتی ندی کا پانی کہاں روک کر کیسا باندھ باندھنا ہے اور پھر اُس باندھ کا پانی کتنی دور تک سینچنے کے لئے لے جانا ہے، یہ فن بھیل تیر کمان کی طرح اپنے کندھے پر ہی رکھتے تھے۔ اس طرح باندھے گئے باندھوں اور تالابوں کے پانی کے دباؤ کی بھی انہیں خوب پرکھ رہتی تھی۔ دباؤ کتنا ہے اور کتنی دوری کے کنوؤں کو وہ ہرا کر دے گا، یہ راز وہ اپنے تیر سے لکیر کھینچ کر بتا سکتے تھے۔

راجستھان میں یہ کام مینا (मीणा) کرتے تھے۔ الور ضلع میں ایک چھوٹا سا نیا ادارہ "ترُن بھارت سنگھ" نے پچھلے 20 برسوں میں 7500 سے زیادہ تالاب بنائے ہیں۔ اُسے ہر گاؤں میں یہی لگا کہ پورا گاؤں تالاب بنانا جانتا ہے، مشکل سے مشکل معاملہ میں اِس ادارہ کو باہر سے کوئی صلاح نہیں لینی پڑی کیونکہ اندر ہی تو مینا تھے جو پیڑھیوں سے یہاں تالاب بناتے رہے ہیں۔

بھیلوں کی کئی قسمیں تھیں، نایک (नायक)، نایکا، چولی والا نایک، کپاڑیا نایک، بڑا نایک، چھوٹا نایک اور پھر تلاویا، گراسیا، سب تالاب اور پانی کے کام کے رہنما مانے جاتے تھے۔

نایک یا مہاراشٹر کوکن میں نائک کا اعزاز بنجارا سماج میں بھی تھا۔ جنگل میں ڈیرہ ڈالنے والے بنجر، بنجر دھیرے دھیرے بنجارے کہلانے لگے۔ یہ آج قابلِ رحم بنا دیے گئے ہیں، لیکن ایک زمانہ میں یہ ایک شہر سے دوسرے شہر سیکڑوں جانوروں پر مال لاد کر تجارت کرنے نکلتے تھے۔ گنگنے کے علاقے سے دھان کے علاقے میں

تمام وسائل
سے لیس سماج

گڑ لے جاتے اور پھر دھان لا کر دوسرے علاقوں میں بیچتے تھے۔

شاہجہاں کے وزیر آصف جہاں جب ۱۶۴۳ء میں دکن آئے تھے تو اُن کی فوج کا سامان بھنگی جنگی نام کے نایک بنجاروں کے بیلوں پر لادا تھا۔ بیلوں کی تعداد تھی ایک لاکھ اسّی ہزار۔ بھنگی جنگی کے بغیر شاہی فوج ہل نہیں سکتی تھی، ان کی تعریف میں وزیر آصف جہاں نے سونے سے لکھا ہوا ایک تامر پتر عطا کیا تھا۔

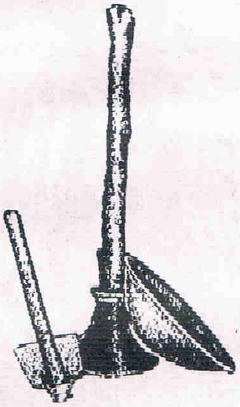

تفصیلات میں کچھ مبالغہ ہوگا لیکن ان کے کاروانوں میں جانور اتنے ہوتے تھے کہ گننا مشکل ہو جاتا تھا۔ تب اُسے ایک لاکھ مویشی کا کارواں مان لیا جاتا تھا اور ایسی ٹولی کا نایک لاکھا بنجارا کہلاتا تھا۔ بنجاروں، مویشیوں کے اس کارواں کو سیکڑوں لوگ لے کر چلتے تھے۔ اس کے ایک دن کے پڑاؤ پر پانی کی کتنی مانگ ہوتی ہوگی، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جہاں یہ جاتے، وہاں اگر پہلے سے بنا تالاب نہیں ہوتا تو پھر وہاں تالاب بنانا وہ اپنی ذمہ داری گردانتے۔ مدھیہ پردیش کے ساگر نام کی جگہ میں بنا خوبصورت اور بڑا تالاب ایسے ہی کسی لاکھا بنجارے نے بنوایا تھا۔ چھتیس گڑھ میں آج بھی کئی گاؤں میں لوگ اپنے تالاب کو کسی لاکھا بنجارے سے جوڑ کر یاد کرتے ہیں۔ ان انجانے لاکھا بنجاروں کے ہاتھوں سے بنے معلوم تالابوں کی فہرست میں کئی صوبوں کے نام سما جائیں گے۔ گونڈ سماج کا تالابوں سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ مہاکوشل میں گونڈوں کا یہ رویہ جگہ جگہ تالابوں کی شکل میں بکھرا ملے گا۔ جبل پور کے پاس کونڈن کے ذریعے بنایا گیا تال آج تقریباً ایک ہزار برس بعد بھی کام دے رہا ہے۔ اسی سماج میں رانی دُرگاوتی ہوئی جس نے اپنے چھوٹے سے دورِ حکمرانی میں ایک بڑے علاقے کو تالابوں سے بھر دیا تھا۔

گونڈ نہ صرف خود تالاب بناتے بنواتے تھے بلکہ تالاب بنانے والے دوسرے لوگوں کا بھی خوب اعزاز کرتے تھے۔ گونڈ راجاؤں نے شمالی ہند سے کوہلی سماج کے لوگوں کو آج کے مہاراشٹر کے بھنڈارا ضلع میں بہت خوشی کے ساتھ لاکر بسایا تھا۔ بھنڈارا میں بھی اسی سبب بہت اچھے تالاب ملتے ہیں۔

بڑے تالابوں کی گنتی میں سب سے پہلے آنے والا مشہور بھوپال تال بنایا تو راجا بھوج نے تھا لیکن اس کا منصوبہ کالیا نامی ایک گونڈ کی مدد سے ہی پورا ہو سکا تھا۔ بھوپال ہوشنگ آباد کے بیچ گھاٹی میں بہنے والی کلیا سوت ندی اسی گونڈ سردار کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

اوڑیا، اوڑہی، اورہی، اوڑ، اُوڑ جیسے جیسے جگہ بدلی، ویسے ویسے ان کا نام بدلتا تھا لیکن کام ایک ہی تھا۔ دن رات تالاب اور کنویں بنانا۔ اتنے کہ گننا ممکن نہ ہو۔ ایسے لوگوں کے لیے ہی کہاوت بنی تھی کہ اوڑ ہر روز نئے کنویں سے پانی پیتے ہیں۔ بنانے والے اور بننے والی چیز کے ہم آہنگ ہونے کی اس سے اچھی مثال شاید ہی ملے کیونکہ کنویں کا ایک نام اوڑ بھی ہے۔ یہ مغرب میں ٹھیٹھ گجرات سے راجستھان، اتر پردیش، خاص طور پر بلند شہر اور اس کے آس پاس کے علاقے، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، اڑیسہ تک پھیلے تھے۔ ان کی تعداد کافی رہی ہوگی۔ اڑیسہ میں کوئی بلائے ناگہانی آنے پر نولاکھ اوڑھیوں کے دھار شہر میں پہنچنے کی کہانی ملتی ہے۔ یہ گدھے پالتے تھے، کہیں یہ گدھوں سے مٹی ڈھوکر صرف پال بناتے تھے، تو کہیں تالاب کی مٹی کاٹتے تھے۔ زیادہ تر عورت مرد ایک ساتھ کام کرتے تھے۔ اوڑھی مٹی کے اچھے جانکار ہوتے تھے۔ مٹی کے رنگ اور مٹی کی بو سے خاصیت معلوم کر لیتے تھے۔ مٹی کی سطح اور دباؤ بھی خوب پہچانتے تھے۔ راجستھان میں تو آج بھی کہاوت ہے کہ اوڑھی کبھی دب کر نہیں مرتے۔

مشہور لوک نایکا جسما اوڑھن دھار نگری کے ایسے ہی ایک تالاب پر کام کر رہی تھی، جب راجا بھوج نے اُسے دیکھ کر اپنا راج پاٹ تک چھوڑنے کا فیصلہ لے لیا تھا۔ راجا نے جسما کو سونے سے بنی ایک اپسرا کی طرح دیکھا تھا۔ لیکن اوڑھی خاندان میں پیدا ہونے والی جسما اپنے کو، اپنے جسم کو تو کیا دنیا تک کو مٹی ماننے والی روایت کا حصہ تھی۔ قصہ بتاتا ہے کہ راجا جسما کو پانے کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا، اپنے فرائض کو چھوڑ کر جو نہیں کرنے کے لائق تھا، وہ بھی کرنے لگا تھا۔ جسما ایسے راجا کی رانی بننے سے پہلے موت کا انتخاب کرنا طے کرتی ہے۔ راجا کا نام مٹ گیا لیکن جسما اوڑھن کا ذکر (जस) آج بھی اُڑیسہ سے لے کر چھتیس گڑھ، مہاکوشل، مالوہ، راجستھان اور گجرات میں پھیلا ہوا ہے۔ سینکڑوں سال بیت گئے ہیں، ان حصوں میں فصل کٹنے کے بعد آج بھی رات رات بھر جسما اوڑھن کے گیت گائے جاتے ہیں، نوٹنکی کھیلی جاتی ہے، بھروئی کے منچوں سے لے کر بھارت بھون، راشٹریہ ناٹیہ ودھالیہ تک میں جسما کے پاؤں پڑے جاتے ہیں۔

جسما اوڑھن کا ...... یش تو لوگوں کے دل میں باقی رہا لیکن اوڑھیوں کا تالاب اور کنویں والی قربانی کو نئے لوگوں نے بھلا دیا ہے۔ جو سچ مچ ملک کے معمار تھے، انہیں غیر یقینی روزی روٹی کی تلاش میں بھٹکنے کے لئے مجبور کر دیا گیا ہے۔ کئی اوڑھی آج بھی وہی کام کرتے ہیں۔ اندرا نگر کو بنانے میں ہزاروں اوڑھی لگے تھے۔ لیکن 'جس' قربانی کا جذبہ چلا گیا ہے اُن کا۔

اُڑیسہ میں اوڑھیوں کے علاوہ سونپورہ اور مہاپاتر بھی تالاب اور کنویں کے معمار رہے ہیں۔ یہ گنجام، پوری، کونزارک اور آس پاس کے علاقوں میں پھیلے تھے۔ سونپورہ بالمپور ضلع کے سونپور گاؤں سے نکلے لوگ

تھے۔ ایک طرف یہ مدھیہ پردیش جاتے تھے تو دوسری طرف نیچے آندھرا تک۔ کھریا ذات رامگڑھ، بلاسپور اور سرگوجا کے آس پاس تالاب، چھوٹے باندھ اور نہروں کا کام کرتی تھی۔ 1971 کی مردم شماری میں ان کی تعداد 23 ہزار تھی۔

بہار میں مُسہر، بہار سے جڑے اتر پردیش کے حصوں میں لُنیا، مدھیہ پردیش میں نونیا، دُسادھ اور کول ذات بھی تالاب بنانے میں مگن رہتی تھی۔ مُسہر لُنیا اور نونیا تب آج جیسے لاچار نہیں تھے۔ اٹھارہویں صدی تک مُسہروں کو تالاب پورا ہونے پر مناسب معاوضہ کے ساتھ ساتھ زمین بھی دی جاتی تھی۔ نونیا، لُنیا کی تالاب بنانے پر پوجا ہوتی تھی۔ مٹی کے پارکھ مُسہر کا سماج میں اپنا مقام تھا۔ کسی زمانے میں چوہرل اُن کے ایک طاقتور رہنما تھے۔ شری سلیس (شیلیش) دُسادھ کے لئے محترم تھے۔ ان کے گیت جگہ جگہ گائے جاتے ہیں اور انہیں دوسرے لوگ بھی عزت دیتے ہیں۔ دُسادھ جب شری سلیس کے یگیہ کرتے ہیں تو دوسری ذاتوں کے لوگ بھی اُس میں حصہ لیتے ہیں۔

انہیں علاقوں میں بسی ہوئی تھی ڈانڑھی نام کی ایک برادری۔ یہ مشکل اور محنتی کام کرنے کے لئے مشہور تھے اور اس فہرست میں تالاب اور کنویں تو شامل تھے ہی۔ بہار میں آج بھی کسی مشکل کام کا ٹھیک حل نہ سوجھے تو کہہ دیتے ہیں "ڈانڑھی لگادو"۔ ڈانڑھی بہت ہی خوبصورت مضبوط کاٹھی کی ذات تھی۔ اس ذات کے سڈول، گٹھیلے جسم مچھلی (پٹھے) گننے کی دعوت دیتے تھے۔

آج کے بہار اور بنگال میں بسے ہوئے سنتھال بھی خوبصورت تالاب بناتے تھے۔ سنتھال پرگنے میں بہت کچھ مٹ جانے کے بعد بھی کئی 'آہر' یعنی تالاب سنتھالوں کی فنی مہارت کی یاد دلاتے ہیں۔ مہاراشٹر کے ناسک علاقے میں کوہلیوں کے ہاتھوں اتنے باندھ اور تالاب بنے تھے کہ اس حصہ پر قحط کا سایہ نہیں پڑتا تھا۔ سمندری ساحلی گوا اور کونکن پردیش گھنگھور بارش کے علاقے ہیں، یہاں برسات کا میٹھا پانی دیکھتے ہی دیکھتے کھارے پانی کے بحر ذخار میں مل جاتا ہے۔ یہ گواڑی برادری کی ہی مہارت تھی کہ مغربی گھاٹ کی پہاڑیوں پر اوپر سے نیچے تک کئی تالابوں میں برسات کا پانی سال بھر روک کر رکھا جاتا تھا۔ یہاں اور اس سے ہی جڑے کرناٹک کے شمالی کنڑ علاقے میں چیرے نام کا پتھر ملتا ہے۔ تیز برسات اور بہاؤ کو اسی پتھر کے سہارے باندھا جاتا ہے۔ چیرے پتھر کو کھدانوں سے نکال کر ایک معیاری شکل میں تراشا جاتا رہا ہے۔ اس شکل میں رتی بھر تبدیلی نہیں آیا ہے۔ اتنا منظم کام بغیر کسی انتظامی ڈھانچہ کے نہیں ہوسکتا تھا۔ ذہانت اور تنظیم کے مناسب تال میل کے بغیر ملک میں اتنے سارے تالاب نہ تو بن سکتے تھے، نہ قائم رہ سکتے تھے۔ یہ تنظیم کتنی چست اور درست رہی ہوگی، اس سوال کا جواب جنوب کی ایک جھلک سے مل جاتا ہے۔

جنوب میں سینچائی کے لئے بننے والے تالاب 'ایری' کہلاتے ہیں۔ گاؤں گاؤں میں 'ایریاں' تھیں اور نظر انداز کئے جانے والے 200 برسوں کے اس دور کے باجود ان میں سے ہزاروں 'ایریاں' آج بھی عوام کا سہارا ہیں۔ گاؤں میں پنچایت کے اندر ہی ایک طرف تنظیم ہوتی تھی: 'ایری واریموؤ'۔ ایری واریمو میں گاؤں کے چھ ممبروں کی ایک سال کے لئے تقرر ہوتا تھا۔ ایری سے متعلق ہر ایک کام - ایری بنانا، اُس کا رکھ رکھاؤ، سینچائی کا مناسب اور غیر جانب دارانہ انتظام اور ان سب کاموں کے لئے ممکنہ ضروری وسائل مہیا کرنا واریمو کے ذمہ ہوتا تھا۔ واریمو کے چھ ممبران ان کاموں کو ٹھیک سے نہیں کر پائیں تو انہیں تقرری کی میعاد سے پہلے بھی ہٹایا جاسکتا تھا۔

یہاں ایری بنانے کا کام وُوڈار کرتے تھے۔ سینچائی کے پورے انتظام کے لئے عہدہ ہوتا تھا۔ اسے الگ الگ علاقوں میں نیرگھنٹی، نیرگنٹی، نیرآنی، کم بک کٹی اور مائین تھوٹی کے ناموں سے جانا جاتا تھا۔ تالاب میں کتنا پانی ہے، کتنے کھیتوں میں سینچائی ہونی ہے، پانی کی تقسیم کس طرح کرنی ہے، یہ سارے کام نیرگھنٹی کرتے تھے۔ نیرگھنٹی کا عہدہ مختلف علاقوں میں صرف ہریجن کو ہی دیا جاتا تھا اور سینچائی کے معاملے میں اُن کا فیصلہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ کسان کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو، اس معاملے میں نیرگھنٹی سے چھوٹا ہی مانا جاتا تھا۔

ایک طرف جنوب میں نیرگھنٹی جیسے ہریجن تھے تو مغرب میں پالیوال جیسے برہمن بھی تھے۔ جیسلمیر، جودھپور کے پاس دسویں صدی میں پلّی نگر میں بسنے کی وجہ سے یہ پلّیوال یا پالیوال کہلائے۔ ان برہمنوں کو ریگستانی زمین میں برسنے والے تھوڑے سے پانی کو پوری طرح سے روک لینے کا اچھا فن آتا تھا۔ وہ 'کھڈین' کے اچھے معمار تھے۔ ریتیلی زمین کا کوئی ایسا بڑا ٹکڑا جہاں پانی بہہ کر آتا ہو، وہاں دو یا تین طرف سے مینڈ بنا کر پانی روک کر خاص طریقے سے تیار کئے گئے باندھ نما کھیت کو 'کھڈین' کہا جاتا ہے۔ کھڈین کھیت بعد میں ہے، پہلے تو تالاب ہی ہوتا ہے۔ ریتیلی زمین میں سینکڑوں من اناج انہیں کھڈینوں میں پیدا کیا جاتا رہا ہے۔ آج بھی جودھپور، جیسلمیر، باڑمیر علاقے میں سینکڑوں کھڈین کھڑے ہیں۔

لیکن پانی کے کام کے علاوہ عزت نفس کیا ہوتی ہے، اسے پالیوال ہی جانتے تھے۔ جیسلمیر میں نہ جانے کتنے گاؤں پالیوالوں کے تھے۔ راجا سے کسی وقت اختلاف ہوا، بس راتوں رات پالیوالوں کے گاؤں خالی ہوگئے۔ ایک سے ایک قیمتی، خوبصورت گھر، کنویں، کھڈین سب چھوڑ کر پالیوال ریاست سے باہر ہوگئے۔ آج اُن کے ویران گاؤں اور گھر جیسلمیر میں سیاحوں کو گائڈ بڑے فخر سے دکھاتے ہیں۔ پالیوال وہاں سے نکل کر کہاں گئے، اس کا ٹھیک اندازہ نہیں ہے، لیکن ایک خاص شاخ آگرہ اور جونپور میں جا بسی تھی۔

مہاراشٹر میں چتپاون بھی تالاب بنانے سے جڑے تھے، کچھ دوسرے برہمنوں کو یہ ٹھیک نہیں لگا کہ

برہمن مٹی کھودنے اور ڈھونے کے کام میں لگیں۔ کہا جاتا ہے واسودیو چتلے نامی چتپاون برہمن کی۔ واسودیو نے کئی تالاب، باؤڑیاں اور کنوئیں بنائے تھے۔ جب وہ پرشورام علاقے میں ایک بڑا تالاب بنا رہے تھے اور اُن کو دیکھ کر بہت سے برہمن بھی مٹی کھود رہے تھے تو دیوڑکھ نامی مقام سے آئے ہوئے برہمنوں کے ایک گروپ نے اُن کی مخالفت کی۔ تب واسودیو نے اُنہیں بددعا دی کہ جو بھی برہمن تمہارا ساتھ دیں گے وہ بے روح ہو کر لوگوں کی نفرت کے سزاوار ہوں گے۔ اُس چتپاون کی بددعا سے بعد میں یہ لوگ دیوڑکھ برہمن کہلائے۔ دیوڑکھ برہمن بے روح ہوئے کہ نہیں، عوامی نفرت کے مستحق بنے کہ نہیں، یہ تو معلوم نہیں لیکن چتپاون برہمنوں نے اپنے علاقے اور ملک میں بھی ہر معاملے میں اپنی خاص پہچان بنا رکھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خیر کے کام کرنے والے برہمنوں کو بھی تالاب نے ہی اُس وقت سماج میں برہمن کا درجہ دلایا تھا۔ جیسلمیر کے پاس پوکران میں رہنے والا یہ طبقہ تالاب بنانے کا کام کرتا تھا۔ اُنھیں مشہور پشکر جی کے تالاب کو بنانے کا کام سونپا گیا تھا۔ ریت سے گھرے بہت دشوار گزار علاقے میں ان لوگوں نے دن رات ایک کر کے خوبصورت تالاب بنایا۔ جب وہ بھرا تو خوش ہو کر انہیں برہمن کا درجہ دیا گیا۔ پشکرنا برہمنوں کے یہاں کدال کی شکل والی مورتی کی پوجا کی جاتی رہی ہے۔

اپنے پورے جسم پر رام نام کا گدنا گدوانے اور رام نام کی چادر اوڑھنے والے چھتیس گڑھ کے ''رام نامی'' تالابوں کے اچھے جانکار تھے۔ اُن کے لیے مٹی کا کام رام کا ہی نام تھا۔ رائے پور، بلاسپور اور رائے گڑھ ضلعوں پھیلے ہوئے اس فرقے کے لوگ چھتیس گڑھ علاقے میں گھوم گھوم کر تالاب کھودتے رہے ہیں۔ ممکن ہے اس گھومنے کی وجہ سے ہی انہیں بنجارا بھی مان لیا گیا تھا۔ چھتیس گڑھ میں کئی گاؤں میں لوگ یہ کہتے ہوئے مل جائیں گے کہ اُن کا تالاب بنجاروں نے بنایا تھا۔ رام نامی خاندانوں میں ہندو ہوتے ہوئے بھی سفر آخرت میں اگنی (آگ) نہیں دی جاتی تھی، مٹی میں دفنایا جاتا تھا کیونکہ ان کے لیے مٹی سے بڑا اور کچھ نہیں تھا۔ زندگی بھر رام کا نام لے کر تالاب کا، مٹی کا کام کرنے والے کے لیے زندگی کے اختتام کا اس سے زیادہ پاک اور کون سا رواج ہوگا؟

آج یہ سب بے نام ہو گئے ہیں، اُن کے ناموں کو یاد کرنے کی یہ نام- مالا، گج دھر سے لے کر رام نامی تک کی 'نام- مالا' ادھوری ہی ہے۔ سب جگہ تالاب تھے اور سب جگہ انہیں بنانے والے لوگ تھے۔

سینکڑوں، ہزاروں تالاب صفر میں سے ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اُنہیں بنانے والے لوگ آج صفر بنا دیے گئے ہیں۔

☆☆☆☆

ساگر کے آگر

تالاب ایک بڑا صفر ہے اپنے آپ میں۔

لیکن تالاب چوپایوں کے کھرے سے بن گیا کوئی ایسا گڑھا نہیں کہ اُس میں برسات کا پانی اپنے آپ بھر جائے۔ اس صفر کو بہت سوچ سمجھ کر، بڑی باریکی سے بنایا جاتا رہا ہے۔ چھوٹے سے لے کر ایک اچھے بڑے تالاب کے کئی اجزا اور ذیلی اجزا ہوتے تھے۔ ہر ایک کا اپنا ایک خاص کام ہوتا تھا اور اس لئے ایک خاص نام بھی۔ تالاب کے ساتھ ساتھ یہ اُسے بنانے والے سماج کی زبان اور بولی کے مالدار ہونے کا بھی ثبوت تھا۔ لیکن جیسے جیسے سماج تالابوں کے معاملے میں غریب ہوا، ویسے ویسے زبان سے بھی یہ نام، الفاظ دھیرے دھیرے اُٹھتے گئے۔

بادل اُٹھے، اُمڈے اور پانی جہاں گرا، وہاں کوئی ایک جگہ ایسی ہوتی ہے جہاں پانی بیٹھتا ہے۔ ایک عمل ہے: آگورنا، یعنی اکھٹا کرنا، اسی سے بنا ہے آگور۔ آگور تالاب کا وہ جز ہے، جہاں سے اس کا پانی آتا ہے۔ یہ وہ ڈھال ہے جہاں برستا پانی ایک ہی سمت میں چل پڑتا ہے۔ اس کا ایک نام پنڈھال بھی ہے۔ آگور کو مدھیہ پردیش کے کچھ علاقوں میں پیٹھو پورا (पैठू पैरा) یا پین (पैन) کہتے ہیں۔ اس جز کے لئے آجکل، ہندی کی کتابوں، اخباروں، اداروں میں ایک نیا لفظ چل پڑا ہے۔ 'جلاگمن علاقہ' یہ انگریزی کے کیچ مینٹ سے لیا گیا ترجمہ، بناوٹی اور ایک حد تک غلط ہے۔ جلاگمن کا مطلب ہے بارش کا موسم۔

آگور کا پانی جہاں آکر بھرے گا، اُسے تالاب نہیں کہتے، وہ ہے آگر۔ تالاب تو سب اجزا۔ اور ذیلی اجزا کا حاصل جمع ہے۔ آگر یعنی گھر، خزانہ، تالاب کا خزانہ ہے آگر، جہاں سارا پانی آکر جمع ہوگا۔ راجستھان میں یہ لفظ تالاب کے علاوہ بھی رائج ہے، سرکاری بسوں کے ڈپو بھی آگر کہلاتے ہیں۔ آگرہ نام بھی اسی سے بنا ہے۔ آگر نام کے کچھ گاؤں بھی کئی صوبوں میں مل جائیں گے۔

آگور اور آگر، ساگر کے دو خاص اجزا مانے گئے ہیں۔ انہیں الگ الگ علاقوں میں کچھ اور ناموں سے بھی جانا جاتا ہے۔ کہیں یہ لفظ اصل سنسکرت کے گھستے گھستے بولی میں آسان ہوتے نظر آتے ہیں تو کہیں ٹھیٹھ دیہاتی علاقوں میں بولی کو سیدھے سنسکرت تک لے جاتے ہیں۔ آگور کہیں آو (आव) ہے، تو کہیں پایتان، یعنی جہاں تالاب کے پیر پسرے ہوں۔ آیتن ہے جہاں یہ پسرا ہوا حصہ سکڑ جائے یعنی آگر۔ اسے کہیں کہیں بھراؤ بھی کہتے ہیں۔ آندھرا پردیش میں پہنچ کر یہ 'پریواہ پردیشم' کہلاتا ہے۔ آگر میں آگور سے پانی

آتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں آگر کے بیچوں بیچ کنویں بھی کھودے جاتے ہیں۔ اِن سے بھی تالاب میں پانی آتا ہے۔ اسے بوگلی کہتے ہیں۔ بہار میں بوگلی والے سینکڑوں تالاب ہیں۔ بوگلی کا ایک نام چوہر (चूहर) بھی ہے۔

پانی کے اس آگر کی، قیمتی خزانے کی حفاظت کرتی ہے پال۔ پال لفظ پالک سے آیا ہوگا۔ یہ کہیں بھینڈ (भींड) کہلایا اور شکل میں چھوٹا ہوا تو پینڈ (पींड)۔ بھینڈ کا جھنڈ بھی ہے بہار میں، اور کہیں مہار بھی، پشتہ لفظ بعد میں آیا ہے۔ کچھ علاقوں میں یہ پار ہے، ندی کے پار کی طرح کنارے کے معنی میں۔ پار کے ساتھ آر بھی ہے۔ آر پار اور تالاب کے اِس پار سے اُس پار کو 'آر پار' یا 'پار آر' کے بدلے پاراوار بھی کہتے ہیں۔ آج پاراوار لفظ تالاب یا پانی سے نکل کر آنند (لطف) کی مقدار بتانے کے لیے استعمال میں آرہا ہے، لیکن پہلے یہ پانی کے آنند (لطف) کا 'پاراوار' رہا ہوگا۔

پار یا پال بہت مضبوط ہوتی ہے لیکن اس رکھوالے کی بھی رکھوالی نہ ہوتو آگور سے آگر میں لگاتار بھرنے والا پانی اِسے کب پار کر لے اور تب اُس کا غضب ناک بہاؤ اور زور اُسے دیکھتے ہی دیکھتے مٹا سکتے ہیں۔ تالاب کو ٹوٹنے سے بچانے والے اس جز کا نام ہے ''اُپھرا''۔ آگر تو ہوا تالاب کا پیٹ یہ ایک حد تک بھرنا ہی چاہیے، تبھی تالاب کا سال بھر تک کوئی مطلب ہے، لیکن اُس حد کو پار کر لے تو پال پر خطرہ ہے۔ پیٹ پورا بھر گیا، اُپھر گیا تو اب اُسے خالی کرنا ہے۔ یہ کام اُپھرا کرتی ہے اور پیٹ کو پھٹنے سے، تالاب اور پال کو ٹوٹنے سے بچاتی ہے۔

اس جز کے کئی نام ہیں۔ اُپھر کہیں اُبرا ہو جاتا ہے۔ اُبرا، اوبرا بھی ہے جو شاید اوبر، اُبرنے، بچنے بچانے کے معنی میں بنے ہیں۔ راجستھان میں یہ سب نام رائج ہیں۔ اچھی برسات ہوئی اور تالاب میں پانی اتنا آیا کہ اُپرا سے نکلنے لگے تو اُسے اُپرا چلنا اور مدھیہ پردیش، اتر پردیش کے کئی علاقوں میں اسے چادر چلنا بھی کہتے ہیں۔ چھتیس گڑھ میں اس حصہ کا نام ہے 'چھلکا' - پال کو توڑے بنا جہاں سے پانی چھلک جائے۔

اس حصہ کا پُرانا نام 'اُچھواس' تھا، چھوڑ دینے کے معنی میں۔ نکاس سے یہ نکاسی بھی کہلاتا ہے، لیکن ٹھیٹھ سنسکرت سے آیا ہے نیشٹا (नेष्टा)۔ یہ راجستھان کے تھار علاقے میں، جیسلمیر، بیکانیر، جودھپور میں سب جگہ، گاؤں میں، شہروں میں بغیر کسی تبدیلی کے نیشٹا ہی کہلاتا ہے۔ سرحد پار کر کے سندھ میں یہ اسی نام سے رائج ہے، یہ جنوب میں کالنگل ہے تو بندیل کھنڈ میں بگرن یعنی جہاں سے تالاب کا اضافی پانی بگر جائے، نکل جائے۔

نیشٹا کو پہلے سال چھوٹا بناتے ہیں، پال سے بھی بہت نیچے۔ نئی پال بھی پانی پیئے گی، کچھ دھنسے گی، اس لیے تالاب میں پانی زیادہ روکنے کی لالچ نہیں کرتے۔ جب ایک برسات سے معاملہ پکا ہو جاتا ہے تو پھر

اگلے سال نیشٹا تھوڑی اور اوپر اٹھاتے ہیں، تب تالاب زیادہ پانی روک سکتا ہے۔

نیشٹا مٹی کی کچی پال کا کم اونچا حصہ ہے لیکن پانی کا خاص زور برداشت کرتا ہے اس لئے اُسے پکا یعنی پتھر چونے کا بنایا جاتا ہے۔ نیشٹا کے دائیں بائیں کا حصہ نصف دائرہ کی گولائی لئے ہوتا ہے۔ تاکہ پانی کا زور اس سے ٹکرا کر کم ہوسکے۔ اس گولائی والے جز کا نام ہے ناکا۔ اگر یہی جز تالاب کے بدلے بندھان پر بنے یعنی کسی چھوٹی ندی نالے کے بہاؤ کو روکنے کے لئے بنائے گئے چھوٹے بندھ پر بنے تو اسے اوڑھ (ओड) کہتے ہیں۔ پنکھے کی شکل کی وجہ سے کہیں اسے پنکھا بھی کہتے ہیں۔

نیشٹا ہے تو لفظ تکنیکی جز، لیکن کہیں کہیں ایسا بھی نیشٹا بنایا جاتا تھا کہ تکنیکی ہوتے ہوئے بھی وہ فنّی لطافت کو چھو لیتے ہیں۔ جن مستعد گج دھروں کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ اُن کے ہاتھوں سے ایسے فنکارانہ کام آسانی سے ہی ہوجاتے تھے۔ راجستھان کے جودھپور ضلع میں ایک چھوٹا سا شہر ہے پھلودا۔ وہاں شیوسا گر نامی ایک تالاب ہے۔ اس کا گھاٹ لال پتھر سے بنایا گیا ہے۔ گھاٹ ایک سیدھی لائن میں چلتے چلتے پھر یکا یک خوبصورت لہراتے سانپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ نصف دائرہ نما گولائی تالاب سے باہر نکلنے والے پانی کی رفتار کم کرتی ہے۔ جیومیٹری کا یہ خوبصورت کھیل بغیر کسی بھونڈے تکنیکی بوجھ کے، سچ مچ کھیل کھیل میں ہی اضافی پانی کو باہر کر کے شیوسا گر کی رکھوالی بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے کرتا ہے۔

واپس آگور چلیں۔ یہیں سے پانی آتا ہے آگر میں صرف پانی لانا ہے اور مٹی اور ریت کو روکنا

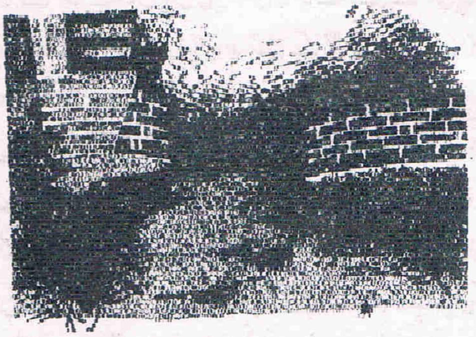

شیوسا گر کی فنکارانہ نیشٹا

ہے۔ اس لیے آگور کے پانی کو چھوٹے چھوٹے بل دیتے ہوئے نالوں کے ذریعہ کچھ خاص راستوں سے آگر کی طرف لایا جاتا ہے اور تالاب میں پہنچنے سے کافی پہلے ان نالووں پر کھرا (खुर्रा) لگایا جاتا ہے۔ شاید یہ لفظ چوپائے کے کھر سے بنا ہے۔ اس کی شکل کھر جیسی ہوتی ہے۔ بڑے بڑے پتھر کچھ اس طرح سے جما دیے جاتے ہیں کہ اُن کے بیچ میں سے صرف پانی نکلے، مٹی اور ریت وغیرہ پیچھے جم جائے، چھوٹ جائے۔

ریگستانی علاقوں میں ریت کی مقدار میدانوں علاقوں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے وہاں تالاب میں کُھرے زیادہ منظم اور کچے کے بجائے پکے بھی بنتے ہیں۔ پتھروں کو گارے چونے سے جما کر باقاعدہ ایک ایسی دومنزلی پلیا بنائی جاتی ہے، جس میں سے اوپری منزل کی کھڑکیوں یا سوراخوں سے پانی جاتا ہے، ان سوراخوں کے نیچے سے ایک نالی میں آتا ہے اور وہاں پانی سارا وزن کنکر، ریت وغیرہ چھوڑ کر صاف ہوکر پھر پہلی منزل کے سوراخوں سے باہر نکل کر آگور کی طرف بڑھتا ہے۔ کئی طرح کے چھوٹے چھوٹے، اونچے نیچے سوراخوں سے پانی چھان کر آگر میں بھیجنے والا یہ ڈھانچہ چھیدی کہلاتا ہے۔

اس طرح روکی گئی مٹی کے بھی کئی نام ہیں۔ کہیں یہ ساد ہے، گارد ہے، لدی ہے، تو کہیں تلچھٹ بھی۔ پوری احتیاط رکھنے کے بعد بھی ہر سال پانی کے ساتھ کچھ نہ کچھ مٹی آگر میں آ ہی جاتی ہے۔ اُسے نکالنے کے بھی موقع اور طریقے بہت منظم رہے ہیں۔ اُن کی تفصیل بعد میں۔

ابھی پھر پال پر چلیں۔ پال کہیں سیدھی، کہیں نصف ہلالی، دوج کے چاند کی طرح بنتی ہے تو کہیں اس میں ہمارے ہاتھ کی کہنی کی طرح ایک موڑ ہوتا ہے، یہ موڑ کہنی ہی کہلاتا ہے۔ جہاں بھی پال پر آگور سے آنے والے پانی کا بڑا جھٹکا لگ سکتا ہے وہاں پال کی مضبوطی بڑھانے کے لئے اُس پر کہنی دی جاتی ہے۔

جہاں ممکن ہے اور وسائل ہیں، وہاں پال اور پانی کے بیچ پتھر کے پاٹ لگائے جاتے ہیں۔ پتھر جوڑنے کا کام 'جہانا' (जुहाना) کہلاتا ہے۔ چھوٹے پتھر گارے سے جوڑے جاتے تھے اور اس گھول میں ریت، چونا، بیل پھل (بل پتر)، گُڑ، گوند اور میتھی ملائی جاتی تھی، کہیں کہیں رال بھی۔ بڑے وزنی پتھر، سوراخ اور کیل طریقے سے جوڑے جاتے تھے۔ اس میں ایک پتھر میں سوراخ چھوڑتے ہیں دوسرے میں اُسی شکل کی کیل اتا دیتے تھے۔ کبھی کبھی پتھر لوہے کی پتی سے جوڑتے تھے۔ ایسی پٹی جونگی یا اُنکڑی کہلاتی تھی۔ پتھر کے پاٹ، پال کی مٹی کو آگر میں آنے سے روکتے ہیں۔ پتھروں سے پٹا ہوا یہ علاقہ پاٹھیال کہلاتا ہے۔ پاٹھیال پر خوبصورت مندر، بارہ دری، چھتری اور گھاٹ بنانے کا رواج ہے۔

تالاب اور پال کی شکل کافی بڑی ہو تو پھر گھاٹ پر پتھر کی سیڑھیاں بھی بنتی ہیں۔ کہیں بہت بڑا گہرا تالاب ہے تو سیڑھیوں کی لمبائی اور تعداد بھی اُسی تناسب میں بڑھ جاتی ہیں۔ ایسے میں پال کی طرح ان

سیڑھیوں کو بھی مضبوطی دینے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ایسا نہ کریں تو پھر پانی سیڑھیوں کو کاٹ سکتا ہے۔ انہیں سہارا دینے کے لئے بیچ بیچ میں برج نما، چبوترے جیسی بڑی سیڑھیاں بنائی جاتی ہیں۔ ہر آٹھ یا دس سیڑھیوں کے بعد آنے والا یہ ڈھانچہ ہتھنی کہلاتا ہے۔

ایسی ہی کسی ہتھنی کی دیوار میں ایک بڑا آلا بنایا جاتا ہے اور اس میں گھٹوئیا بابا کی مورتی نصب کی جاتی ہے۔ گھٹوئیا دیوتا گھاٹ کی رکھوالی کرتے ہیں، اکثر اپرا کی اونچائی کے حساب سے ان کی استھاپنا ہوتی ہے۔ اس طرح آگور میں پانی زیادہ برسے، آگر میں پانی کی سطح لگاتار اونچی اُٹھنے لگے، تالاب پر خطرہ منڈلانے لگے تو گھٹوئیا بابا کے پاؤں تک پانی آنے کے بعد، اپرا چل نکلے گا اور پانی کا بڑھنا تھم جائے گا۔ اس طرح گھاٹ کی، تالاب کی رکھوالی دیوتا اور انسان مل کر کرتے رہے ہیں۔

تالابوں کی طرح ندیوں کے گھاٹوں پر بھی گھٹوئیا بابا کی استھاپنا ہوتی ہے۔ باڑھ کے دنوں میں جو بڑے بوڑھے، دادا دادی گھاٹ پر خود نہیں جا پاتے، وہ وہاں سے لوٹنے والے اپنے ناتی پوتوں، بیٹے بیٹیوں سے بہت تجسس اور بے چینی سے اکثر یہی سوال کرتے ہیں، ''پانی کہاں تک چڑھا ہے؟'' گھٹوئیا بابا کے چرنوں تک آ گیا؟'' اُن کے پاؤں پانی پکھار لے تو بس سب ہو گیا۔ اتنا پانی آگر میں ہو جائے تو پھر کام چلے گا سال بھر۔

سال بھر آگر کے پانی کی مقدار کو، خزانے کو جانچنے ناپنے کا کام کرتے ہیں اُن میں الگ الگ مقاموں پر لگنے والے ستون۔ 'ناگ یشٹی' بہت پرانا لفظ ہے۔ یہ نئے کھودے گئے تالابوں میں پانی کی سطح ناپنے کے کام آتا ہے۔ ان پر اکثر ناگ وغیرہ کندہ کئے جاتے تھے۔ جن پر ناگ کا نقش نہیں ہو، ایسے ستون صرف یشٹ ( ) بھی کہلاتے تھے۔۔ دھیرے دھیرے گھستے گھستے یہی لفظ 'لاٹھ' بنا۔ یہ ستون بھی کہلاتا ہے اور 'جل تھمب' یا صرف 'تھمب' بھی، کہیں اسے 'بنسال' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ستون الگ الگ جگہوں پر لگتے ہیں۔ لگانے کے مواقع بھی الگ ہوتے ہیں اور پلاننگ بھی کئی طرح کی۔

ستون تالاب کے بیچوں بیچ، اپرا پر، موکھی پر، یعنی جہاں سے سینچائی ہوتی ہے وہاں پر اور آگور میں لگائے جاتے ہیں۔ ان میں فٹ، گز وغیرہ انجانے نشانوں کے بدلے پدم، شنکھ، ناگ، چکر جیسے نشان بنائے جاتے ہیں۔ الگ الگ نشان پانی کی ایک مقررہ گہرائی کی اطلاع دیتے ہیں۔ سینچائی کے لئے بنے تالابوں میں ستون کے ایک خاص نشان تک پانی کی سطح اُتر آنے کے بعد پانی کا استعمال فوراً روک کر اُسے پھر خطرے کے وقت کے لئے محفوظ رکھنے کا انتظام کیا جاتا رہا ہے۔ کہیں کہیں پال پر بھی ستون لگائے جاتے ہیں۔ لیکن پال کے ستون کے ڈوبنے کا مطلب ہے 'پالے' یعنی بربادی ہونا۔

ستون پتھر کے بنتے تھے اور لکڑی کے بھی۔ لکڑی اس قسم کی منتخب کی جاتی تھی جو مضبوط ہو اور پانی میں سڑے گلے نہیں۔ ایسی لکڑی کا ایک پرانا نام جھریہ کاشٹھ تھا۔ زیادہ تر جامن، سال، تاڑ اور سرئی کی لکڑی اس کام میں لائی جاتی رہی ہے۔ ان میں سال کی مضبوطی کی کئی کہاوتیں رہی ہیں جو آج بھی ڈوبی نہیں ہیں۔ سال کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''ہزار سال کھڑا، ہزار سال پڑا اور ہزار سال سڑا۔'' چھتیس گڑھ کے کئی پرانے تالابوں میں آج بھی سال کے ستون مل جائیں گے۔ رائے پور کے آثار قدیمہ کے عجائب خانہ میں سال کے پیڑ کا سچ مچ سینکڑوں سال سے بھی پرانا ایک ٹکڑا رکھا ہے جو کہاوت کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ ایک آبی ستون کا جز ہے، جو اُسی علاقے میں (چندرپور) ضلع بلاسپور کے گاؤں کرائی میں ہری بندھ نامی تالاب سے ملا ہے۔ ہری بندھ دوسری صدی سے پہلے کے سات واہنوں کے دور حکومت کا ہے۔ اس پر سرکاری حاکموں کے نام کندہ ہیں جو ممکنہ طور پر اُس شاندار تالاب کے بھرنے کی تقریب میں موجود تھے۔ حالات نہ بدلیں تو لکڑی خراب نہیں ہوتی، ستون ہمیشہ پانی میں ڈوبے رہتے تھے، اس لئے سالوں تک خراب نہیں ہوتے تھے۔

کہیں کہیں پال یا گھاٹ کی ایک پوری دیوار پر الگ الگ اونچائی پر طرح طرح کی مورتیاں بنائی جاتی تھیں۔ یہ اکثر چہرہ کی شکل کی ہوتی تھیں۔ سب سے نیچے گھوڑا تو سب سے اوپر ہاتھی۔ تالاب کی بڑھتی ہوئی آبی سطح انہیں سلسلہ وار چھوتی تھی اور سب کو معلوم ہو جاتا تھا کہ اس بار پانی کتنا بھر گیا ہے۔ اس طریقہ کار کی زندہ مثالیں جیسلمیر کے امر ساگر کی دیوار پر گھوڑے، ہاتھی اور شیر کی مورتیاں ہیں۔

ستون اور نیشتا (नेष्टा) کو ایک دوسرے سے جوڑ دینے پر تو عجوبہ ہو ہی جاتا ہے۔ الور سے کوئی سو کلو میٹر دور اراولی کی پہاڑیوں کے اوپر آبادی سے کافی دور ایک تالاب ہے 'شیام ساگر'۔ یہ ممکنہ جنگ کے موقع پر فوج کی ضرورت پوری کرنے کے لئے پندرہویں صدی میں بنایا گیا تھا۔ اس میں کنارے پر 'ورون دیوتا' کا ایک ستون ہے۔ ستون کی اونچائی کے حساب سے ہی اس سے کوئی ایک فرلانگ کی دوری پر شیام ساگر کی اپرا ہے۔ بڑھتی آبی سطح نے ورون دیوتا کے پیر چھوئے نہیں کہ اپرا چلنے لگتی ہے اور تالاب میں پھر اُس سے زیادہ پانی بھرتا نہیں۔ ورون دیوتا वरुण देवता کبھی ڈوبتے نہیں۔

ستون تالاب کی آبی سطح کی نشان دہی کرتے تھے لیکن تالاب کی گہرائی ہمیشہ 'پرش' (पुरुष) یا پُرس پیمانے سے ناپی جاتی تھی۔ دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا کر کھڑے ہوئے آدمی کے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک کی کل لمبائی پُرس یا پُرکھ کہلاتی تھی۔ انچ فٹ میں یہ کوئی چھ فٹ ہوتا ہے۔ ایسے 20 پُرس گہرائی کا تالاب مثالی خیال کیا جاتا تھا۔ تالاب بنانے والوں کی خواہش اسی 'بیسی' کو چھونے کی ہوتی تھی۔ لیکن بنانے والوں کی اہلیت اور آگور- آگر کی گنجائش کے مطابق یہ گہرائی کم زیادہ ہوتی رہتی ہے۔

اکثر بیسی یا اُس سے بھی زیادہ گہرے تالابوں میں پال پر لہروں کا زور توڑنے کے لئے آگور اور آگر کے بیچ جزیرے چھوڑ دیے جاتے تھے، ایسے تالاب بناتے وقت گہری کھدائی کی ساری مٹی پال پر چڑھانے کی ضرورت نہیں رہتی، ایسی صورت میں اُسے اور بھی دور یعنی تالاب سے باہر لا کر پھینکنا بھی مشکل ہوتا ہے، اس لئے بیسی جیسے گہرے تالابوں میں تکنیکی اور عملی ضرورت سے تالاب کے بیچ جزیرے جیسی ایک یا ایک سے زیادہ جگہیں چھوڑ دی جاتی تھیں، ان پر کھدائی کی اضافی مٹی بھی ڈال دی جاتی تھی۔ تکنیکی مضبوطی اور عملی آسانی کے علاوہ لبالب بھرے تالاب کے بیچ میں اُبھرے یہ جزیرے پورے منظر کو اور بھی دلکش بنا دیتے۔ جزیرے، ٹپوا، ٹیکری اور دیپ جیسے الفاظ تو اس جز کے لئے ملتے ہی ہیں لیکن راجستھان میں تالاب کے اس خاص حصہ کو ایک خاص نام دیا گیا ہے۔'لاکھے ٹا' (लाखेटा)۔

'لاکھے ٹا' لہروں کا زور توڑتا ہے، وہ تالاب اور سماج کو جوڑتا بھی ہے۔ جہاں کہیں بھی لاکھے ٹا ملتے ہیں، اُن پر اُس علاقے کے کسی سدھ سنت، ستی یا یاد رکھنے کے لائق کسی شخص کی یادگار میں چھتری بنی ملتی ہے۔ لاکھے ٹا بڑا ہوا تو چھتری کے ساتھ 'کھے جڑی' اور پیپل کے درخت بھی لگے ملیں گے۔

سب سے بڑا 'لاکھے ٹا'؟ آج اس لاکھے ٹا پر ریل کا اسٹیشن ہے۔ بس اسٹینڈ ہے اور ایک قابل قدر مانا گیا جدید علاقہ بھی بسا ہے، جس میں ہندوستان الیکٹرو گریفائٹ جیسے عظیم کارخانے لگے ہیں۔ مدھیہ ریلوے سے بھوپال ہو کر اٹارسی جاتے ہوئے منڈی دیپ نامی یہ جگہ ایک زمانے میں بھوپال تال کا 'لاکھے ٹا' تھا۔ کبھی لگ بھگ 250 مربع میل میں پھیلا ہوا یہ عظیم تالاب ہوشنگ شاہ کے دور میں توڑ دیا گیا تھا۔ آج یہ سکڑ کر بہت چھوٹا ہو گیا ہے پھر بھی اس کا شمار ملک کے بڑے تالابوں میں ہی ہوتا ہے۔ اس کے سوکھنے سے ہی منڈی دیپ دیپ نہ رہ کر ایک صنعتی شہر بن گیا ہے۔

رواج، طریقہ (प्रणाली) اور سارنی (सारणी) تالاب سے جڑے دو لفظ ہیں، جنھوں نے اپنے معنوں کی لگاتار توسیع کی ہے۔ کبھی یہ تالاب وغیرہ سے جڑے سینچائی انتظام کے لئے بنی نالیوں کے نام تھے۔ آج تو حکومت کا بھی طریقہ ہے اور ریلوں کا وقت بتانے والی جدول بھی۔ سینچائی کی خاص نالی جہاں سے نکلتی ہے وہ جگہ اہم (मुख) ہے، اسے 'موکھا' اور 'موکھی' بھی کہتے ہیں۔ خاص نہر 'رج بہا' (रजबहा) کہلاتی ہے۔

بہت ہی خاص تالابوں کی رج بہا اس (لوک راج) اس دنیا سے نکل کر (دیولوک) دیوتاؤں کی دنیا کو بھی چھو لیتی تھی۔ تب اُس کا نام 'رام نال' ہو جاتا تھا۔ جیسلمیر کے ٹھیٹ ریگستانی علاقے میں بنے ہوئے گھنے خوبصورت باغیچے 'بڑا باغ' کی سینچائی جیت سر (जैतसर) نامی ایک بڑے تالاب سے نکلی ہوئی رام نال سے ہی ہوتی رہی ہے۔ یہاں کی امرائی (अमराई) اور باغ واقعتاً اتنے گھنے ہیں کہ اس ریگزار میں آگ

اُگلنے والا سورج یہاں آتا بھی ہوگا تو صرف ٹھنڈک لینے اور وہ بھی ہرے رنگ میں رنگ کر۔

رج بہا سے نکلنے والی دوسری نہریں بہتول (बहलोल)، برہا (बरहा)، بہیا (बहिया)، بہا (बहा) اور باہ (बाह) بھی کہلاتی ہیں۔ پانی نکلنے کے راستے پر بعد آباد ہونے والے علاقوں کے نام انہیں الفاظ کی بنیاد پر رکھے گئے ہیں، جیسے آگرہ کی باہ نامی تحصیل۔

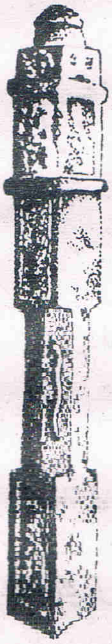

آبی سطح کا معیار
ناگ متون

سینچائی کے لئے بنے ہوئے چھوٹے تالابوں میں بھی پانی نکالنے کا بہت باقاعدہ انتظام ہوتا رہا ہے۔ پال کے کسی حصہ میں سے آر پار نکالی گئی نالی کا ایک سرا تالاب کی طرف سے ڈاٹ لگا کر بند رکھا جاتا ہے۔ جب بھی پانی نکالنا ہو، ڈاٹ کھول دیا جاتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے کے لئے کسی کو پانی میں کودنا پڑے گا، اُس گہرائی تک جا کر ڈاٹ ہٹانا ہوگا اور پھر اسی طرح بند کرنا پڑے گا۔ اس باہمت کام کو سب کے لئے آسان بناتا ہے ڈاٹ نامی جز۔

ڈاٹ پال سے تالاب کے اندر کی طرف بنا ہوا ایک چھوٹا سا لیکن گہرا حوض نما ڈھانچہ ہوتا ہے۔ یہ مربع نما جوڑ زیادہ تر دو سے تین ہاتھ کا ہوتا ہے۔ پانی کی طرف کی دیوار میں ضرورت کے حساب سے دو تین سوراخ الگ الگ اونچائی پر کئے جاتے ہیں۔ سوراخ کا سائز ایک بتے کی طرح کا ہوتا ہے یا اتنا جتنا کہ ایک لکڑی کے لٹھے سے بند ہو سکے۔ سامنے والی دیوار میں پھر اسی طرح کے سوراخ ہوتے ہیں، لیکن صرف نیچے کی طرف۔ اِن سے پال کے اُس پار نالی سے پانی باہر نکالا جاتا ہے۔ جوڑ کی گہرائی آٹھ سے بارہ ہاتھ ہوتی ہے اور نیچے اُترنے کے لئے دیوار پر ایک ایک ہاتھ پر پتھر کے ٹکڑے لگے رہتے ہیں۔

اِس ڈھانچہ کی وجہ سے پانی کا ڈاٹ کھولنے کے لئے تالاب کے پانی میں نہیں اُترنا پڑتا، بس سوکھے حوض میں پتھر کے ٹکڑوں کے سہارے نیچے اُتر کر جس سوراخ کو کھولنا ہو، اُس کی ڈاٹ ہٹا کر پانی جاری کر دیا جاتا ہے۔ پال کی طرف والی نالی سے وہ باہر آنے لگتا ہے، ڈاٹ سے ملتے جلتے ڈھانچے راجستھان، مدھیہ پردیش، اتر پردیش، بہار، مہاراشٹر، تاملناڈو اور گوا تک ملتے ہیں۔ نام ضرور بدل جاتے ہیں جیسے : چکرینڈ (चुकरेंड)، چُرنڈی (चुरंडी)، چونڈا (चुंडा)، چُنڈا (चैंडा) اور اُرینڈ (उरेंड)۔ سبھی میں پانی باہر انڈیلنے کا عمل ہوتا ہے اور اس لئے یہ سارے نام انڈیلنے کے عمل کو ظاہر کرتے ہیں اور اس لئے یہ سارے نام انڈیلنے کی ہی جھلک دکھاتے ہیں۔

تالاب سے نہر میں انڈیلا گیا پانی ڈھلان سے بہا کر دور دور لے جایا جاتا ہے۔ لیکن کچھ بڑے تالابوں میں، جہاں موکھی کے پاس پانی کا دباؤ بہت زیادہ رہتا ہے، وہاں اس دباؤ کا استعمال نہر میں پانی اوپر

چڑھانے کے لئے بھی کیا جاتا ہے۔ اس طرح موگھی سے نکلا ہوا پانی کچھ ہاتھ اوپر اٹھ کر پھر نہر کی ڈھال پر بہتے ہوئے نہ صرف زیادہ دور تک جاتا ہے، بلکہ وہ کچھ اوپر بنے کھیتوں میں بھی پہنچ سکتا ہے۔

ابتدائی نہر کے دونوں جانب تھوڑی تھوڑی دور پر کنویں بھی بنائے جاتے ہیں۔ ان میں رہٹ لگا کر پھر سے پانی اُٹھالیا جاتا ہے۔ تالاب، نہر اور کنویں کے ساتھ رہٹ کی یہ شاندار چوکڑی ایک کے بعد ایک کئی کھیتوں کو سینچائی سے جوڑتی چلی جاتی ہے۔ یہ نظام بندیل کھنڈ میں چندیلوں، بندیلوں کے زمانے میں بنے ہوئے ایک ہزار ایکڑ کے برووا ساگر، ارجر ساگر میں آج بھی کام دے رہا ہے۔ برووا ساگر' اور چھا' کے راجا اُدت سنگھ نے اور ارجر سورج سنگھ نے ۱۷۳۷ء اور ۱۶۷۱ء میں بنوائے تھے۔ ان کی نہریں آج بھی صوبے کی سینچائی محکمہ کی عزت افزائی کر رہی ہیں۔

پانی کی اسمگلنگ/ چوری؟ سارا انتظام ہو جائے لیکن پانی کی چوری نہ روکی جائے تو اچھا خاصا تالاب دیکھتے ہی دیکھتے سوکھ جاتا ہے۔ برسات میں تالاب بھرا، خزاں میں صاف ستھرے نیلے رنگ میں ڈوبا، جاڑے میں ٹھنڈا ہوا، بسنت میں جھوما اور پھر موسم گرما میں؟ تپتا ہوا سورج تالاب کا سارا پانی کھینچ لے گا۔ شاید تالاب کے تعلق سے ہی سورج کا ایک نام ''امبوتسکر'' رکھا گیا ہے۔ تسکر ہو سورج جیسا اور آگر یعنی خزانہ بغیر پہرے کے کھلا پڑا ہو تو چوری ہونے میں کیا دیری؟

اس چوری کو روکنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے، تالاب کے آگر کو ڈھال دار بنا کر۔ جب پانی کم ہونے لگتا ہے تو کم مقدار کا پانی زیادہ رقبہ میں پھیلے رہنے سے روکا جاتا ہے۔ آگر میں ڈھال ہونے سے پانی کم حصہ میں زیادہ مقدار میں موجود رہتا ہے۔ اور جلدی بھاپ بن کر اُڑ نہیں پاتا۔ ڈھال دار سطح میں اکثر تھوڑی گہرائی بھی رکھی جاتی ہے۔ ایسے گہرے گڑھے کو اکھڑا (अरवड़ा) یا پیال (पियाल) کہتے ہیں۔ بندیل کھنڈ کے تالابوں میں اسے 'بھر' (भर) کہتے ہیں۔ کہیں کہیں اسے بنڈارو (बंडारो) یا گرل (गर्ल) کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس جز کا مقام خاص گھاٹ کی جانب رکھا جاتا ہے۔ یا تالاب کے ٹھیوں بیچ۔ بیچ میں گہرا ہونے سے گرمی کے دنوں میں چاروں طرف سے تالاب سوکھنے لگتا ہے۔ ایسے میں پانی گھاٹ چھوڑ دیتا ہے۔ یہ اچھا نظر نہیں آتا۔ اس لئے خاص گھاٹ کی طرف پیال رکھنے کا رواج زیادہ رہا ہے۔ تب تین طرف سے پانی کی تھوڑی بہت چوری ہوتی رہتی ہے، لیکن چوتھی خاص سمت میں پانی برابر بنا رہتا ہے۔

موسم گرما ختم ہوا نہیں کہ بادل پھر اُٹڈنے لگتے ہیں۔ آگور سے آگر بھرتا ہے اور ساگر پھر لہرانے لگتا ہے۔ سورج پانی چراتا ہے تو سورج ہی پانی دیتا ہے۔

☆☆☆☆

بے داغ پیشانی کا معاشرہ

تالاب میں پانی آتا ہے پانی جاتا ہے، اس آوک جاوک کا پورے تالاب پر اثر پڑتا ہے۔ بارش کی تیز بوندوں سے آگور کی مٹی ڈھلتی ہے تو آگر میں مٹی گھلتی ہے۔ پال کو مٹی کاٹتی ہے تو آگر میں مٹی بھرتی ہے۔

تالاب کی شبیہہ بگڑنے کا یہ کھیل باقاعدہ چلتا رہتا ہے۔ اس لئے تالاب بنانے والے لوگ، تالاب بنانے والا سماج تالاب کی شبیہہ کو بگڑنے سے بچانے کا کھیل بھی اُتنی ہی باقاعدگی سے کھیلتا رہا ہے۔ جو تالاب دیکھتے ہی دیکھتے پچھلے پچاس-سو برسوں میں برباد کردیئے گئے ہیں، اُن تالابوں نے قاعدہ سے کھیلے گئے کھیلوں کی وجہ سے ہی سینکڑوں برسوں تک سماج کا کھیل ٹھیک سے چلایا تھا۔

پہلی بار پانی بھرا نہیں کہ تالاب کی رکھوالی کا، رکھ رکھاؤ کا کام شروع ہوجاتا تھا۔ یہ آسان نہیں تھا۔ لیکن سماج کو ملک کے اس کونے سے اُس کونے تک ہزاروں تالابوں کو ٹھیک ٹھاک بنائے رکھنا تھا، اس لئے اُس نے اس مشکل کام کو ہر جگہ اتنا باقاعدہ بنالیا تھا کہ یہ سب بالکل صحیح ڈھنگ سے ہوتا رہتا تھا۔

آگور میں قدم رکھا نہیں کہ رکھ رکھاؤ کا پہلا کام دیکھنے کو مل جائے گا۔ دیش کے کئی علاقوں میں تالاب کا آگور شروع ہوتے ہی اُس کی اطلاع دینے کے لئے پتھر کے خوبصورت ستون لگے ملتے ہیں۔ ستون کو دیکھ کر سمجھ لیں کہ اب آپ تالاب کے آگور میں کھڑے ہیں۔ یہیں سے پانی تالاب میں بھرے گا۔ اس لئے اس جگہ کو صاف ستھرا رکھنا ہے۔ جوتے وغیرہ پہن کر آگور میں نہیں آنا ہے، سمت میدان وغیرہ کی بات دور، یہاں تھوکنا تک منع رہا ہے۔ 'جوتے پہن کر آنا منع ہے'، 'تھوکنا منع ہے'، جیسے بورڈ نہیں ٹھونکے جاتے تھے لیکن سبھی لوگ بس ستون دیکھ کر ان باتوں کا پورا پورا دھیان رکھتے تھے۔

آگر کے پانی کو صاف ستھرا رکھنے کا کام بھی پہلے دن سے ہی شروع ہوجاتا تھا، نئے بنے ہوئے تالاب میں جس دن پانی بھرتا، اُس دن جشن کے ساتھ اُس میں زندہ جانور لاکر چھوڑے جاتے تھے۔ ان میں مچھلیاں، کچھوے، کیکڑے اور اگر تالاب بڑا ہے تو مگرمچھ بھی چھوڑے جاتے تھے۔ کہیں کہیں زندہ جانوروں کے ساتھ حیثیت کے مطابق چاندی یا سونے کی جانور بھی غرقاب کیے جاتے تھے۔ چھتیس گڑھ کے رائے پور شہر میں ابھی کوئی پچاس پچپن برس پہلے تک تالاب میں سونے کی نتھ پہنا کر کچھوے چھوڑے گئے تھے۔

پہلے سال میں کچھ خاص قسم کی بناسپتی بھی ڈالی جاتی تھی۔ الگ الگ علاقوں میں ان کی قسم بدلتی تھی لیکن کام ایک ہی تھا۔ پانی کو صاف رکھنا۔ مدھیہ پردیش میں یہ 'گدیا' یا 'چیلا' تھے جو راجستھان میں 'کُمدنی'

(कुमुदिनी)، نرملی (निर्मली) چانگکش (चाक्षुष) چانگکش سے ہی چاکسو لفظ بنا ہے۔ کوئی ایک دور آیا ہوگا کہ تالاب کے پانی کی صفائی کے لئے چاکسو پودے کا رواج بہت بڑھ گیا ہوگا۔ آج کے جے پور کے پاس ایک بڑے قصبے کا نام چاکسو ہے۔ یہ نام شاید چاکسو پودے کے لئے اظہار عقیدت کے طور پر رکھا گیا ہوگا۔ پال پر پیپل، برگد اور گولر کے درخت لگائے جاتے رہے ہیں۔ تالاب اور ان پیڑوں کے بیچ عمر کو لے کر ہمیشہ ہوڑ سی دکھائی دیتی تھی۔ کون زیادہ ٹکتا ہے۔ پیڑ یا تالاب؟ لیکن یہ سوال اکثر لاجواب ہی رہا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کا لمبا ساتھ اتنا بھایا ہے کہ اَن دیکھی کے اس جدید دور میں جو بھی پہلے گیا، دوسرا غم میں اُس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ پیڑ کٹے ہیں تو تالاب بھی کچھ وقت میں سوکھ کر پٹ گیا ہے اور اگر پہلے تالاب برباد ہوا ہے تو پیڑ بھی بہت دن نہیں ٹک پائے ہیں۔

تالابوں پر آم بھی خوب لگایا جاتا رہا ہے۔ لیکن یہ پال پر کم، پال کے نیچے کی زمین میں زیادہ ملتا ہے۔ چھتیس گڑھ علاقہ میں بہت سے تالابوں میں شیتلا ماتا کا گھر مانا گیا ہے اور اس لئے ایسے تالابوں کی پال پر نیم کے پیڑ ضرور لگائے جاتے رہے ہیں۔ بنا پیڑ کی پال کا موازنہ بنا مورتی کے مندر سے بھی کیا گیا ہے۔

بہار اور اتر پردیش کے بہت سے علاقوں میں پال پر ارہر کے پیڑ بھی لگائے جاتے تھے۔ انہیں علاقوں میں نئے بنے تالاب کی پال پر کچھ وقت تک سرسوں کی کھلی کا دھواں کیا جاتا تھا تاکہ نئی پال میں چوہے وغیرہ بل بنا کر اُسے کمزور نہ کر دیں۔

یہ سب کام ایسے ہیں جو تالاب بننے پر ایک بار کرنے پڑتے ہیں، یا بہت ضروری ہو گیا تو ایک آدھ بار اور لیکن تالاب میں ہر سال مٹی جمع ہوتی ہے، اس لئے اُسے ہر سال نکالتے رہنے کا انتظام خوبصورت قاعدوں میں باندھ کر رکھا گیا تھا۔ کہیں گاد (साद) نکالنے کے مشکل کام کو ایک تقریب، تہوار میں بدل کر تفریح کا موقع بنایا گیا تھا تو کہیں اُس کے لئے اچھا طریقہ اختیار کیا گیا کہ جس طرح وہ چپ چاپ تالاب کی تہ میں آکر بیٹھتی تھی، اُسی طرح چپ چاپ اُسے باہر نکال کر پال پر جما دیا جاتا تھا۔ گاد نکالنے کا وقت الگ الگ علاقوں میں موسم کو دیکھ کر طے کیا جاتا رہا ہے۔ اُس وقت تالاب میں پانی سب سے کم رہنا چاہیے، گوا اور مغربی گھاٹ کے ساحلی علاقوں میں یہ کام دیوالی کے فوراً بعد کیا جاتا ہے۔ شمال کے بہت بڑے حصہ میں نئے سال یعنی چیت سے ٹھیک پہلے، تو چھتیس گڑھ، اڑیسہ، بنگال، بہار اور جنوب میں برسات سے پہلے۔

آج کا سماج تالابوں سے کٹ گیا، اُسے چلانے والا انتظامیہ تالاب کی صفائی اور گاد نکالنے کو ایک مسئلہ کی طرح دیکھتا ہے اور وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے بدلے طرح طرح کے بہانے تلاش کرتا ہے۔ اُس کے نئے حساب سے یہ کام خرچیلا ہے، کئی کلکٹروں نے وقت پر اپنے علاقوں میں تالابوں سے مٹی نہیں نکال

پانے کا ایک بڑا سبب یہی بتایا ہے کہ اس کا خرچ اتنا زیادہ ہے کہ اُس سے تو نیا تالاب بنانا سستا پڑے گا۔ پرانے تالاب صاف نہیں کروائے گئے اور نئے تو کبھی بنے ہی نہیں۔ گاد تالابوں میں نہیں، نئے سماج کے ماتھے میں بھر گئی ہے۔ تب سماج کا ماتھا صاف تھا۔ اُس نے ساد کو مسئلہ کی طرح نہیں بلکہ تالاب کے پرساد کی طرح مانا تھا۔ تبرک کو حاصل کرنے کے مستحق کسان، کمہار اور گھربار والے تھے۔ اس تبرک کو لینے والے کسان مٹی کاٹتے، اپنی گاڑی بھرتے اور اسے کھیتوں میں پھیلا کر ان کی زرخیزی قائم رکھتے، اس تبرک کے بدلے وہ فی گاڑی کے حساب سے کچھ نقد یا فصل کا کچھ حصہ گاؤں کے فنڈ میں جمع کرتے تھے۔ پھر اس رقم سے تالابوں کی مرمت کا کام ہوتا تھا۔ آج بھی چھتیس گڑھ میں لدی نکالنے کا کام خاص طور پر کسان خاندان ہی کرتے ہیں۔ دور دور تک صابن پہنچ جانے کے بعد بھی کئی گھروں میں لدی سے سر دھونے اور نہانے کا رواج جاری ہے۔ بہار میں یہ کام اُڑاہی کہلاتا ہے۔ اُڑاہی سماج کی خدمت ہے، شرمدان ہے۔ گاؤں کے ہر گھر سے کام کر سکنے والے تالاب پر اکھٹا ہوتے تھے۔ ہر گھر دو سے پانچ من مٹی نکالتا تھا۔ کام کے وقت وہیں گڑ یا پانی تقسیم ہوتا تھا، پنچایت میں جمع (हजनि) جتنی کی رقم کا ایک حصہ اُڑاہی کے انتظام میں خرچ ہوتا تھا۔ جنوب میں دھرمادا (धर्मादा) رسم تھی۔ کہیں کہیں اس کام کے لئے گاؤں کی زمین کا ایک حصہ وقف کر دیا جاتا تھا اور اُس کی آمدنی صرف گاد نکالنے کے لئے خرچ کی جاتی تھی۔ ایسی زمین کو'کوڈگے' (कोडगे) کہا جاتا تھا۔

انتظامیہ اور سماج مل کر کمر کس لیں تو پھر کسی کام میں ڈھیل کیسے آئے گی۔ جنوب میں تالابوں کے رکھ رکھاؤ کے معاملے میں راج اور سماج کا یہ تال میل خوب منظم تھا۔ راج کے خزانے سے اس کام کے لئے امداد ملتی تھی لیکن اُسی کے ساتھ ہر گاؤں میں اس کام کے لئے ایک الگ فنڈ کا بھی انتظام ہوتا تھا۔

ہر گاؤں میں کچھ زمین، کچھ کھیت یا کھیت کا کچھ حصہ تالاب کی دیکھ بھال کے لئے وقف کر دیا جاتا تھا۔ اس پر لگان نہیں لگتا تھا۔ ایسی زمین 'مان یم' (मान्यम) کہلاتی تھی۔ مان یم سے ہونے والی بچت، آمدنی یا ملنے والی فصل تالاب سے متعلق طرح طرح کے کام کرنے والے لوگوں کو دی جاتی تھی۔ جتنی طرح کے کام، اُتنی طرح کے مان یم۔ جو کام جہاں ہونا ہے، وہیں اُس کا انتظام کیا جاتا تھا، وہیں اُس کا خرچ نکال لیا جاتا۔ الوتی (अलौति) مان یم سے مزدوروں کا محنتانہ ادا کیا جاتا تھا۔ اعزازی مان یم پورے سال بھر تالاب کی دیکھ ریکھ کرنے والوں کے لئے تھا۔ اسی سے اُن خاندانوں کی گزر اوقات ہوتی تھی جو تالاب کی پال پر چوپایوں کو جانے سے روکتے تھے۔ پال کی طرح تالاب کے آگور میں بھی چوپایوں کے آنے جانے پر روک تھی۔ اس کام میں بھی لوگ سال بھر لگے رہتے تھے۔ اُن کا بندوبست بندیلا مان یم سے کیا جاتا تھا۔

تالاب سے جڑے کھیتوں میں فصل بوائی سے کٹائی تک جانوروں کو روکنا ایک مقررہ میعاد تک

چلنے والا کام تھا۔ یہ بھی بندیلا مان یم سے پورا ہوتا تھا۔ اسے کرنے والے پٹی کہلاتے تھے۔

سینچائی کے وقت نہر کا ڈاٹ کھولنا، وقت پر پانی پہنچانا ایک الگ ذمہ داری تھی۔ اس خدمت کو نیرمنگ مان یم سے پورا کیا جاتا تھا۔ کہیں کسان پانی کی بربادی تو نہیں کر رہے، اسے دیکھنے والوں کی تنخواہ کُلم کول (कलमकवल) مان یم سے ملتی تھی۔ تالاب میں کتنا پانی آیا ہے، کتنے کھیتوں میں کیا کیا بویا گیا ہے، کسے کتنا پانی چاہیے، جیسے سوال 'نیر گھنٹی' یا 'نیروکٹی' حل کرتے تھے۔ یہ عہدہ جنوب میں صرف ہریجن خاندان کو ملتا تھا۔ تالاب کی سطح آب دیکھ کر کھیتوں میں اس کی منصفانہ تقسیم کے باریک حساب کتاب کی فطری صلاحیت نیروکٹی کو وراثت میں ملتی تھی۔ آج کے نئے سماجی ماہرین کا کہنا ہے کہ ہریجن خاندان کو یہ عہدہ مقصد کے تحت دیا جاتا تھا۔ ان خاندانوں کے پاس زمین نہیں ہوتی تھی، اس لئے زمینداروں کے کھیتوں میں پانی کے کسی بھی اختلاف میں وہ غیر جانبدار ہو کر کام کر سکتے تھے۔ اگر صرف بے زمین ہونا ہی صلاحیت کا معیار تھا تو پھر بے زمین برہمن تو ہمیشہ ملتے تھے، لیکن اس بات کو یہیں چھوڑیں اور پھر لوٹیں مان یم پر۔ کئی تالابوں کا پانی سینچائی کے علاوہ پینے کے کام بھی آتا تھا۔ ایسے تالابوں سے گھروں تک پانی لانے والے کہاروں کے لئے 'ارنی' مان یم سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ اُپار (उप्पार) اور وادی مان یم سے تالابوں کی معمولی ٹوٹ پھوٹ ٹھیک کی جاتی تھی۔ وایکل (वायक्कल) مان یم تالاب کے علاوہ اُس سے نکلنے والی نہروں کی دیکھ بھال میں خرچ ہوتا تھا۔ پال سے لے کر نہروں تک پر پیڑ لگائے جاتے تھے اور سال بھر ان کی دیکھ بھال، کاٹ چھانٹ وغیرہ کا کام چلتا رہتا تھا، یہ سارا خرچ مانل (मानल) مان یم سے پورا کیا جاتا تھا۔

کھلگا (खुलगा) مان یم اور پاٹل (पाटुल) مان یم مرمت کے علاوہ علاقے میں بننے والے نئے تالابوں کی کھدائی میں ہونے والے خرچ برداشت کرتے تھے۔ ایک تالاب سے جڑے ہوئے اتنی طرح کے کام، اتنی خدمات سال بھر ٹھیک سے چلتی رہیں، یہ دیکھنا بھی ایک کام تھا، کس کام میں کتنے لوگوں کو لگانا ہے، کہاں سے کچھ کو ہٹانا ہے، یہ سارا انتظام کرے مان یمؤ سے پورا کیا جاتا تھا، اسے کلم ویٹو (कुलम वेट्टू) یا کنزموئی ویٹو (कण्मोई वेट्टू) بھی کہتے تھے۔

جنوب کا یہ چھوٹا اور سادا سا تجزیہ تالاب اور اُس سے جڑے ہوئے پورے نظم کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ تو اتھاہ ہے، ایسی ہی یا اس سے ملتے جلتے انتظامات سبھی علاقوں میں، شمال میں، مشرق میں، مغرب میں بھی رہے ہی ہوں گے۔ لیکن کچھ کام تو غلامی کے اُس دور میں ٹوٹے اور پھر عجیب و غریب آزادی کے اس دور میں چھوٹے سماج میں یہ سب بکھر گیا۔ لیکن گینگ جی کلا جیسے لوگ اس ٹوٹے چھوٹے سماج میں بکھرے ہوئے نظام کو اپنے ڈھنگ سے ٹھیک کرتے رہے ہیں۔

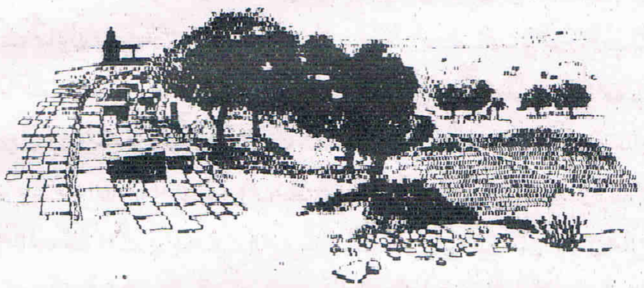

نام تو تھا گنگا جی لیکن پھر نہ جانے کیسے وہ گینگ جی ہو گیا۔ اُن کا نام پیار اور خود سپردگی کی وجہ سے بگڑا یا گھسا ہوگا لیکن اُن کے شہر کو تقریباً سو سال سے گھیرے ہوئے آٹھ شاندار تالاب ٹھیک انتظام کے ختم ہوجانے کے بعد دھیرے دھیرے اُن دیکھی کی وجہ سے تباہ ہونے لگے تھے۔ الگ الگ پیڑھیوں نے انہیں الگ الگ وقت میں بنایا تھا لیکن آٹھ میں سے چھ ایک سلسلہ میں بندھے تھے۔ ان کا رکھ رکھاؤ بھی اُن پیڑھیوں نے سلسلہ میں بندھ کر ہی کیا ہوگا۔ سار سنبھال کی وہ منظّم کڑی کبھی وقت ٹوٹ گئی۔

اس کڑی کے ٹوٹنے کی آواز گینگ جی کے کان میں کب پڑی، پتہ نہیں لیکن آج جو بڑے بوڑھے شہر میں ہیں، وہ گینگ جی کی ایک ہی شبیہ یاد رکھے ہیں: ٹوٹی چپل پہنے گینگ جی صبح سے شام تک ان تالابوں کا چکر لگاتے تھے۔ نہانے والے گھاٹوں پر، پانی لینے والے گھاٹوں پر کوئی گندگی پھیلاتا دِکھائی دے تو اُسے باپ کی طرح ڈانٹ پلاتے تھے۔ کبھی وہ پال کا تو کبھی نیشتا کا معائنہ کرتے۔ کہاں کس تالاب میں کیسی مرمت چاہیے، اس کی اپنے ذہن میں ہی فہرست بناتے، ان تالابوں پر آنے والے بچوں کے ساتھ خود کھیلتے اور انہیں طرح طرح کے کھیل کھلاتے۔ شہر کو تین طرف سے گھیرے ہوئے تالابوں کا ایک چکر لگانے میں 3 گھنٹے لگتے۔ گینگ جی کبھی پہلے تالاب پر دکھائی دیتے تو کبھی آخری پر، کبھی صبح یہاں ملتے تو دوپہر وہاں اور شام نہ جانے کہاں؟ گینگ جی اپنے آپ تالابوں کے رکھوالے بن گئے تھے۔

سال کے آخر میں ایک وقت ایسا آتا جب گینگ جی تالابوں کے بدلے شہر کی گلی گلی گھومتے دکھائی دیتے، ساتھ چلتی بچوں کی فوج۔ ہر گھر کا دروازہ کھولنے پر انہیں بغیر مانگے ایک روپیہ مل جاتا۔ برسوں سے ہر ایک گھر جانتا تھا کہ گینگ جی صرف ایک روپیہ مانگتے ہیں، نہ کم نہ زیادہ، روپیہ بٹورنے کا کام پورا ہوتے ہی وہ پورے شہر کے بچوں کو بٹورتے۔ بچوں کے ساتھ ڈھیر ساری ٹوکریاں، تگاڑیاں، پھاوڑے، کدال بھی جمع ہوجاتے۔ پھر ایک کے بعد ایک تالاب صاف ہونے لگتا، گاد نکال کر پال پر جمائی جاتی، ہر ایک تالاب کے نیشٹا کا کچرہ بھی اسی طرح صاف کیا جاتا، ایک تگاڑی مٹی کچرے کے بدلے ہر بچے کو دوانی انعام میں ملتی، گینگ جی کلا کب سے یہ کام کر رہے تھے - آج کسی کو یاد نہیں۔ بس اتنا پتہ ہے کہ یہ کام سن 55-56 تک چلتا رہا۔ پھر گینگ جی چلے گئے۔ شہر کو ویسی کسی موت کی یاد نہیں۔ پورا شہر شامل تھا اُن کے آخری سفر میں۔ ایک تالاب کے نیچے ہی بنے گھاٹ پر ان کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔ بعد میں وہاں ان کی سمادھی بنائی گئی جو تالاب بناتے تھے، سماج انہیں سنت بنا دیتا تھا، گینگ جی نے تالاب تو نہیں بنایا تھا، پہلے بنے ہوئے تالابوں کی رکھوالی کی تھی، وہ بھی سنت بن گئے تھے۔

پھلودی میں تالابوں کی صفائی کا کھیل سنت کھلواتا تھا تو جیسلمیر میں یہ کھیل خود راجا کھیلتا تھا۔ سبھی کو پہلے سے پتا رہتا تھا، پھر بھی شہر بھر میں راجا کی طرف سے منادی کرائی جاتی تھی، سال کے آخری دن، پھاگن کرشن چودس کو شہر کے سب سے بڑے تالاب 'گھڑی سر' پر لہاس (ल्हास) کھیلنے کا بلاوا ہے۔ اُس دن راجا، ان کا پورا خاندان، دربار، فوج اور پوری جنتا کدال، پھاوڑے، تگاڑیاں لے کر گھڑی سر پر جمع ہوتے، راجا تالاب کی مٹی کاٹ کر پہلی تگاڑی بھرتا اور اُسے خود اُٹھا کر پال پر ڈالتا۔ بس گاجے باجے کے ساتھ لہاس شروع۔ پوری جنتا کا کھانا پینا دربار کی طرف سے ہوتا۔ راجا اور پرجا سب کے ہاتھ مٹی سے سن جاتے، راجا اتنے جذباتی ہوجاتے کہ اُس دن اُن کے کندھے سے کسی کا بھی کندھا ٹکرا سکتا تھا۔ جو دربار میں بھی مہیا نہیں، آج وہی تالاب کے کنارے پر مٹی ڈھو رہا ہے۔ راجا کی حفاظت کا انتظام کرنے والے، اُن کے محافظ بھی مٹی کاٹ رہے ہیں، مٹی ڈال رہے ہیں۔

ایسی ہی ایک لہاس میں جیسلمیر کے راجا تیج سنگھ پر حملہ ہوا تھا۔ وہ پال پر ہی مارے گئے تھے۔ لیکن لہاس کھیلنا بند نہیں ہوا۔ یہ چلتا رہا، پھیلتا رہا، مدھیہ پردیش کے بھیل سماج میں بھی لہاس کھیلا جاتا ہے، گجرات میں بھی لہاس چلتا ہے۔ وہاں یہ رواج تالاب سے آگے بڑھ کر سماج کے ایسے کسی بھی کام سے جڑ گیا تھا جس میں سب کی مدد ضروری ہوتی۔ سب کے لیے سب کی مدد، اسی رواج سے تالاب بنتے تھے، اسی سے اُن کی دیکھ بھال ہوتی تھی۔ مٹی کٹتی تھی، مٹی ڈلتی تھی، سماج کا کھیل لہاس کے اُلہاس، جوش سے چلتا تھا۔ ☆☆

ہزار نام

شان وشوکت کی اونچائی کو نگاہ کی گہرائی سے جوڑنے والے لوگ پوری زندگی کو بس پانی کا ایک بلبلا مانتے رہے ہیں اور دنیا کو ایک عظیم سمندر۔ اس میں پیڑھیاں آتی ہیں، پیڑھیاں جاتی ہیں، زمانہ آتا ہے، زمانہ جاتا ہے، ٹھیک لہروں کی طرح۔ زندگی اور موت کی لہروں سے لہراتے اس دنیا سے کامیاب جانے کا مقصد اپنے سامنے رکھنے والے سماج نے طرح طرح کے تالاب بنائے ہیں اور بہت شوق سے اُن کا نام رکھا ہے۔ یہ نام تالابوں کی خصوصیات پر، رویہ پر تو کبھی کسی خاص واقعہ پر رکھے جاتے تھے۔ اتنے نام، اتنی قسمیں کہ کہیں نام رکھنے میں زبان کا ذخیرہ کم پڑے تو بولی سے اُدھار لیتے تھے تو کہیں ٹھیٹھ سنسکرت تک جاتے تھے۔

ساگر، سرووَر اور سر نام چاروں طرف ملیں گے۔ ساگر لاڈ پیار میں ساگرا بھی ہو جاتا ہے۔ اکثر بڑے تالاب کے معنی میں کم آتا ہے۔ سرووَر کہیں سرور بھی ہے، سر سنسکرت لفظ سرس سے بنا ہے اور گاؤں میں اس کا رس سینکڑوں برسوں سے سر کی شکل میں مل رہا ہے۔ جسامت میں بڑے اور چھوٹے تالابوں کا نام مذکر اور مؤنث الفاظ کی ان جوڑیوں سے جوڑا جاتا رہا ہے: جوہڑ- جوہڑی، بندھ- بندھیا، تال- تلیا اور پوکھر- پوکھری۔ یہ جوڑیاں خاص طور پر راجستھان، مدھیہ پردیش، اتر پردیش، بہار، بنگال میں جگہ جگہ ہیں اور سرحد پار نیپال میں بھی۔ پوکھر سنسکرت کے پشکر سے ملا ہے اور مقامات پر گاؤں گاؤں میں پوکھر ہوا کرتے تھے۔ لیکن بنگال میں تو گھر گھر میں پوکھر ہوا کرتے تھے۔ گھر کے پچھواڑے میں اکثر چھوٹے چھوٹے، کم گہرائی والے پوکھر مچھلی پالنے کے کام آتے تھے۔ وہاں تالاب کے لئے پشکرنی (पुष्करणी) لفظ بھی رائج تھا۔ پشکر تو تھا ہی، پشکر کے بعد میں عزت واحترام میں جو لفظ لگ جانے سے وہ عام پوکھر نہ رہ کر ایک انتہائی اہم تالاب بن جاتا ہے۔ یہ راجستھان میں اجمیر کے پاس پشکر جی نامی مشہور تیرتھ کا علاقہ ہے۔ یہاں برہما جی کا مندر ہے۔

سب سے زیادہ رائج نام تالاب ہی ہے لیکن تالابوں کے نام رکھنے میں اس لفظ کا استعمال سب سے کم ملتا ہے۔ ڈِگّی نام ملتا ہے، کبھی دہلی میں لال قلعہ کے ٹھیک سامنے لال ڈِگّی نام کا ایک بڑا تالاب تھا۔ انبالہ میں ابھی کئی تالاب ہیں اور یہ ڈِگّی ہی کہلاتے ہیں۔ ڈِگّی لفظ 'دی گھی' اور 'دی گھر کا'' جیسے سنسکرت لفظوں سے آیا ہے۔ کنڈ بھی حوض جیسا ہی چھوٹا اور پکے قسم کا ہے، لیکن کہیں کہیں اچھے خاصے تالابوں کا نام کنڈ یا حوض ملتا ہے۔ مدھیہ پردیش کے کھنڈوا شہر میں کنڈ نام سے جانے گئے کئی تالاب ہیں۔ حوض کی مثال دہلی میں حوض خاص ہے جو اب تالاب سے زیادہ ایک محلّہ کی طرح پہچانا جاتا ہے۔

تال کئی جگہ ہیں لیکن اسی سے ملتا جلتا لفظ چال ایک علاقہ میں ہی محدود ہو کر رہ گیا۔ یہ علاقہ ہے اتر پردیش کے ہمالیہ کا، ان پہاڑی ضلعوں میں کبھی گاؤں گاؤں میں چال تھی، میدانی گاؤں، شہروں میں تال آبادی کے بیچ یا نزدیک بنتے ہیں، لیکن پہاڑی گاؤں میں چال گاؤں سے کچھ دور اوپر بنتی تھی۔ چالوں کا استعمال سیدھے پینے کے پانی کے لئے نہیں ہوتا تھا۔ لیکن انہیں چالوں کی وجہ سے گاؤں کے جھرنے سال بھر چلتے تھے۔ پہاڑوں میں تیز برسات کے زور کو جھیلنے، اچانک آنے والی باڑھ روکنے اور سال بھر پانی چلانے کے لئے چالوں کا رواج اتنا زیادہ تھا کہ گاؤں اپنے اوپر کے پہاڑوں میں 30 سے 40 تک چالیں بناتے تھے۔ چال کوئی 30 قدم لمبی، اتنی ہی چوڑی اور کوئی چار پانچ ہاتھ گہری ہوتی تھی۔ یہ کسی ایک حصہ کے ذمہ نہیں ہوتی، کبھی اسے بنانا جانتے تھے اور کبھی اس کی صفائی میں لگتے تھے۔ یہ نستار کے کام آتیں، گاؤں کے چوپایوں کے علاوہ جنگلی جانوروں کے لئے بھی پانی مہیا کرتی تھیں۔ ہمالیہ میں چال کہیں کھال ہے، کہیں تولی ہے تو کہیں چورا بھی۔ آس پاس کے گاؤں انہیں کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ جیسے 'اُبھریں کھال' یا 'رانی چورا' اور 'دودھا تولی'۔ ٹھیٹھ شمال کے الفاظ جنوب تک چلتے ہیں۔ کیرل اور آندھرا پردیش میں 'چیر' اور 'چیروو' (चेरुवु) لفظ تالاب کے معنی ہی رکھتے ہیں۔ چوکور پکّے گھاٹ سے گھرے تالاب چوپرا یا چوپڑا بھی کہلاتے ہیں۔ چوپڑا اجین جیسے قدیم شہر میں، جھانسی جیسے تاریخی شہر میں اور چرگاؤں جیسے ادبی مقام میں بھی ہے۔

چوپرا سے ہی ملتا جلتا ایک نام چودھرا ہے۔ چاروں طرف سے اچھے پکّے گھاٹوں سے گھرا تالاب چودھرا کہلاتا ہے۔ اسی طرح 'تگھرا' (तिघरा) بھی ہے۔ اس میں ایک طرف، شاید آگور کی طرف کا حصہ کچا چھوڑ دیا جاتا تھا، چار گھاٹ اور تین گھاٹ سے ایک قدم آگے بڑھ کر 'اٹھ گھٹی' پوکھر بھی ہوتے تھے، یعنی آٹھ گھاٹ والے۔ الگ الگ گھاٹوں کا الگ الگ استعمال ہوتا تھا۔ کہیں الگ الگ ذات کے لوگوں کے لئے الگ الگ تالاب بنتے تھے تو کہیں ایک ہی بڑے تالاب پر مختلف ذاتوں کے لئے الگ الگ گھاٹ بنا دیتے۔ اس میں عورتوں اور مردوں کے نہانے کے لئے بھی الگ الگ انتظام ہوتا۔ چھتیس گڑھ میں ڈوکی گھاٹ عورتوں کے لئے تو ڈوکا گھاٹ مردوں کے لئے بنتے تھے۔ کہیں گنیش جی تو کہیں ماں درگا تیرائی جاتی تو کہیں تعزیے۔ سب کے الگ گھاٹ۔ اس طرح کے تالابوں میں آٹھ گھاٹ بن جاتے اور وہ پھر اٹھ گھٹی کہلاتے تھے۔

اٹھ گھٹی تال تو دور سے چمک جاتے لیکن گوہیا پوکھر وہاں پہنچنے پر ہی نظر آتے تھے۔ گوہیا یعنی گوہیے (गुह्य)، چھپے ہوئے پوکھر۔ یہ شکل میں چھوٹے ہوتے اور اکثر برساتی پانی کے جمع ہونے سے اپنے آپ بن جاتے تھے۔ بہار میں دو گاؤں کے بیچ غیر آباد علاقہ میں ابھی بھی گوہیا پوکھر ملتے ہیں۔ اپنے آپ بنے ایسے تالابوں کا ایک اور نام ہے 'اُمہا تال' (अमहा ताल)۔ چھتیس گڑھ میں امہا کا مطلب ہے عارضی

آرام (अनायास)۔ گاؤں سے لگے گھنے جنگلوں میں قدرتی شکل میں نچلی زمین میں پانی جمع ہوجاتا تھا، ڈھور - ڈنگروں کے ساتھ آتے جاتے ایسے تالاب 'انایاس' ہی ملتے جاتے ہیں۔ اس راستہ میں اکثر آنے جانے والے لوگ ایسے تالابوں کو تھوڑا ٹھیک ٹھاک کر لیتے ہیں اور اُن کو استعمال میں لاتے ہیں۔

امہا کا ایک مطلب آم تو ہے ہی، آم کے پیڑ سے، بڑی بڑی امرائیوں سے گھرے تال امہا تریا، تال یا 'آماتریا' کہلاتے ہیں۔ اسی طرح امروہا تھا۔ آج یہ ایک شہر کا نام ہے لیکن ایک وقت آم کے پیڑوں سے گھرے تالاب کا نام تھا۔ کہیں کہیں ایسے تال 'امراہ' (अमराह) بھی کہلاتے ہیں۔ پھر جیسے 'امراہ' ویسے ہی (پپراہ) (पिपराह) - پوری پال پر پیپل کے شاندار درخت۔ امراہ، پپراہ میں پال پر یا اُس کے نیچے لگے درخت کتنے ہی ہوں، وہ گنے جاسکتے ہیں، لیکن لکھ پیڑا تال لاکھوں پیڑوں سے گھرا رہتا۔ یہاں لاکھ کا مطلب ان گنت سے رہا ہے۔ کہیں کہیں ایسے تالاب کو لکھراؤں (लखरांव) بھی کہا گیا ہے۔

بھوپال تال نے لکھراؤں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا، اس کی عظمت نے آس پاس رہنے والوں کے فخر کو کبھی کبھی غرور میں بدل دیا تھا۔ کہاوت ہیں بس اسی کو تال مانا: "تال تو بھوپال تال باقی سب تلیا۔" عظیم الشان تالاب کا مختصر تذکرہ بھی حیران کرتا ہے۔ گیارہویں صدی میں راجا بھوج کے ذریعہ بنوایا گیا، یہ تالاب 365 نالوں، ندیوں سے بھر کر 250 مربع میل میں پھیلا تھا۔ مالوہ کے سلطان ہوشنگ شاہ نے پندرہویں صدی میں اسے فوجی حکمت عملی کے تحت توڑا۔ لیکن یہ کام اُس کے لیے جنگ سے کم نہیں ثابت ہوا، اور بھوج پال توڑنے کے لئے ہوشنگ شاہ کو فوج ہی جھونکنا پڑی۔ اتنی بڑی فوج کو بھی اسے توڑنے میں تین مہینے لگے۔ پھر تین سال تک تال کا پانی بہتا رہا، تب کہیں جا کر تہہ نظر آئی۔ لیکن اس کے آگر کا دلدل 30 سال تک بنا رہا۔ سوکھنے کے بعد اس میں کھیتی شروع ہوئی، تب سے آج تک اس میں عمدہ قسم کا گیہوں پیدا ہوتا چلا آرہا ہے۔

بڑوں کی بات چھوڑیں، لوٹ کر آئیں چھوٹے تالاب پر۔ کم گہرے، چھوٹے تالاب 'چکھلیا' کہلاتے تھے۔ یہ نام چکھڑ یعنی کیچڑ سے بنا تھا۔ ایسے تالابوں کا ایک پرانا نام ڈابر بھی تھا۔ آج اُس کو ڈبرا

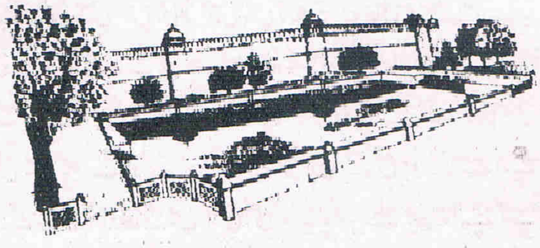

لال قلعہ کے سامنے بنی تھی لال ڈگی

کہتے ہیں۔ بائی یا باؤ بھی ایسے ہی چھوٹے تالابوں کا نام تھا۔ بعد میں یہ نام تالاب سے ہٹ کر باوڑی میں آلگا۔ دہلی میں قطب مینار کے پاس ''راجوں کی باؤ'' نامی باوڑی آج اس لفظ کی طرح ہی پرانی پڑ چکی ہے۔

پرانے پڑ گئے ناموں میں 'نوانڑ' (निवाण)، 'ہد' (हद)، 'کاسار'، 'تڑاگ'، 'تامر پڑنا' (नामप्रपणी)، تالی، 'تل' (तल्ल) بھی یاد کئے جاتے سکتے ہیں۔ ان میں تل ایک ایسا نام ہے جو وقت کے لمبے دور کو پار کر کے بنگال اور بہار میں تللا کی شکل میں آج بھی پایا جاتا ہے۔ اسی طرح پرانا ہوکر ڈوب چکا 'جلاشے' نام اب سرکاری ہندی اور سینچائی محکمہ میں پھر سے اُبھر آیا ہے۔ کئی جگہوں پر بہت پرانے تالابوں کے پرانے نام اگر سماج کو یاد رکھنے کے لائق نہیں لگے تو وہ مٹ جاتے ہیں انہیں پھر ایک نیا نام مل جاتا ہے۔ 'پُرنیہا' (पुरनेहा)، یعنی کافی پرانا تالاب۔ آس پاس کے تالابوں کی گنتی میں آخر میں بنے تالاب نوتال (नवताल)، نوتال (नौताल)، نیا تال کہلانے لگے، وہ پرانے پڑ جاتے تو بھی اسی نام سے جانے جاتے۔ گُچکلیا (गुचकुलिया) ایسے تالاب کو کہتے ہیں جو ہوتا تو چھوٹا ہی ہے لیکن کنارے سے ہی گہرا ہو جاتا ہے۔ 'پل وَل' بھی ایسے ہی گہرے تالاب کا پرانا نام تھا۔ وقت کی تیز رفتار میں یہ نام بھی پیچھے چھوٹ گیا۔ آج اس کی یاد دہلی کے پاس ایک چھوٹے سے قصبے اور ایسے اسٹیشن پل وَل کی شکل میں باقی ہے جس پر سے ریل گاڑیاں بغیر رُکے گزر جاتی ہیں۔

'کھدواَن' (खदुअन) چھتیس گڑھ میں ایسے تالابوں کو کہا جاتا ہے جن کا پانی بے حد صاف رہتا ہے اور پینے کے کام میں آتا ہے۔ 'پن کھتی' (पनखत्ती) تالاب صرف نستاری کے کام آتے ہیں۔ اسی طرح 'لینڈیا تال' اور 'کھر تال' (खुरताल) نستاری، دِشا میدان اور چوپایوں کو پانی پلانے کے لئے ہوتے ہیں۔ الگ الگ آزادانہ طور رسے بنے ہوئے تالابوں کے علاوہ کہیں کہیں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تالابوں کی سانکل بنائی جاتی تھی۔ ایک کا اضافی پانی دوسرے میں، دوسرے کا تیسرے میں، .... یہ طریقہ کم برسات والے راجستھان اور آندھرا کے رائل سیما علاقے میں، اوسط ٹھیک برسات والے بندیل کھنڈ اور مالوہ میں تو زیادہ برسات والے 'گوا' اور 'کون کن' میں عام طور پر ملتا ہے۔ شمال میں ان کا نام سانکل یا سانکھل تال ہے تو جنوب میں 'دَش پھلا' طریقہ۔ تالابوں کی یہ سانکھل موٹے طور پر ایک سے زیادہ یعنی دو سے لے کر دس تالابوں تک ہوتی ہے، سانکھل دو تالابوں کی ہو اور دوسرا تالاب پہلے کے مقابلے بہت ہی چھوٹا ہو تو وہ 'چھپی لائی' (छिपीलाई) کہلاتا ہے، یعنی پہلے بڑے تال کے پیچھے چھپ گئی تلائی۔

لیکن جو تال سامنے ہے اور خوبصورت بھی، اُس کا نام چاہے جو ہو، اُسے سگُری (सगुरी) تال بھی کہتے تھے۔ جس تال میں مگرمچھ رہتے تھے، اُس کا نام چاہے جتنے بڑے راجا کے نام پر ہو، لوگ اپنی احتیاط کے لئے، آگاہی کے لئے اُس کا نام مگرا تال، نکیا یا نکرا رکھ لیتے تھے، نکرا لفظ سنسکرت کے 'نکر' (नक्र) یعنی مگر

سے بنا ہے۔ کہیں گدھیا تال بھی ہے، ان میں مگر کی طرح گدھے نہیں رہتے تھے! گدھا بوجھ ڈھونے کا کام کرتا ہے، ایک گدھا موٹی رسّی کا جتنا بوجھ اُٹھا سکے، اُتنی رسی کی لمبائی برابر گہرا تال گدھیا تال کہلاتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی حادثہ بھی تالاب کا پرانا نام مٹا دیتا تھا۔ یہاں وہاں 'بہمن مارا' تال ملتے ہیں۔ ان کا نام کچھ اور رہا ہوگا، لیکن کبھی اُن میں کسی برہمن کے ساتھ حادثہ ہوا تو بعد میں انہیں بہمن مارا کی طرح ہی یاد رکھا گیا۔ اسی طرح کا ایک اور نام ہے بیراگی تال، اس کی پال پر بیٹھ کر کوئی کبھی بیراگی بن گیا ہوگا۔

ندیوں کے کنارے ندیا تال ملتے ہیں۔ ایسے تال اپنے آگور سے نہیں، ندی کی باڑھ کے پانی سے بھرتے تھے۔ ندیوں کے بدلے کسی پاتالی منبع سے جڑے تال کو 'بھوپھوڑ' (भूफोड़) تال کہتے تھے۔ ایسے تالاب اُن جگہوں میں زیادہ تھے جہاں زیر زمین پانی کی سطح کافی اونچی بنی رہتی تھی۔ شمالی بہار میں ابھی بھی ایسے تالاب ہیں اور کچھ نئے بھی بنائے گئے ہیں۔

رکھ رکھاؤ کے اچھے دور میں بھی کبھی کبھی کسی خاص وجہ سے ایک آدھ تالاب سماج کے لئے بیکار ہو جاتا تھا، ایسے تالاب ہاتی تال کہے جاتے تھے۔ ہاتی لفظ سنسکرت کے ہت (हत) لفظ سے بنا ہے اور اس کے معنی ہیں برباد ہو جانا۔ 'ہت تیرے کی' جیسا فقرہ بول چال میں یہی معنی رکھتا ہے کہ تیری قسمت خراب ہوگئی۔ 'ہت پربھ' (हत-प्रभ) اور 'ہت آشا' یعنی ہتاشا بھی اسی طرح بنے ہیں۔ اسی طرح ہاتی تال چھوڑ دیئے گئے تالاب کے لئے اپنایا گیا نیا نام تھا، لیکن ہاتھی تال بالکل الگ نام ہے، ایسا تالاب جس کی گہرائی ہاتھی کے برابر ہو۔ واپس ہاتی تال لوٹیں۔ جو نام سنسکرت سے لمبا سفر کر کے تھک جائے تو سیدھے بولی میں سے تازہ نام نکل آتا تھا۔ چھوٹا تال، پھٹیرا تال بھی یہاں وہاں مل جائیں گے، جس تالاب پر کبھی جنواسا بن گیا، گاؤں کی دس بارہ براتیں ٹھہر گئیں اُس کا نام باراتی تال پڑ جاتا تھا، لیکن متھلا (بہار) کا دُلھا تال ایک خاص تال ہے، متھلا سیتا جی کا مائکا ہے، اُن کے سوئمبر کی یادگار کے طور پر یہاں آج بھی سوئمبر ہوتے ہیں، فرق اتنا ہے کہ اب بر (دولھا) کا انتخاب لڑکی نہیں کرتی، لڑکی والا کرتا ہے، دُلھا تال پر کچھ مقررہ تاریخوں میں کئی لڑکے والے اپنے لڑکے لے کر جمع ہوتے ہیں، پھر لڑکی والے اُن میں سے اپنی لڑکیوں کے لئے مناسب بر چن لیتے ہیں۔ چھتیس گڑھ میں بھی ایسے کچھ تال ہیں، وہاں ان کا نام دُلہرا تال ہے۔ کئی تالابوں کے نام لمبی کہانیوں میں سے نکلتے ہیں۔ لمبے عرصے تک ان تالابوں نے سماج کی خدمت کی ہے اور لوگوں نے لمبے عرصے تک ان کی لمبی کہانیوں کو جیوں کا تیوں یاد رکھا ہے، ایسے تالابوں میں ایک عجیب نام ہے، 'ہا-ہا پنچ کماری تال'، بہار میں مونگیر کے پاس یہ تالاب ایک اونچے پہاڑ کے نیچے بنا ہے، کہانی میں راجا ہے، اُس کی پانچ بیٹیاں ہیں، جو کسی ناآسودگی کی وجہ سے اونچے پہاڑ سے تالاب میں کود کر جان دے دیتی ہیں، اُن پانچوں کے غم میں

چار پکے گھاٹوں کا چوپڑا

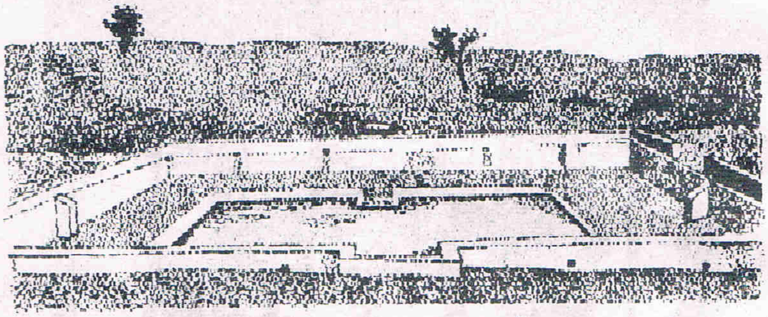

تالاب کا خاص نام بھی محو ہوگیا اور پھر لوگوں نے اُسے 'ہا- ہانچ کماری' کے نام سے ہی آج تک یاد رکھا ہے۔

بہار ہی میں لکھی سرائے علاقہ کے آس پاس بھی 365 تال ایک جھٹکے میں بنے تھے۔ کہانی بتاتی ہے کہ کوئی رانی تھی جو روزانہ ایک نئے تالاب میں غسل کرنا چاہتی تھی، اس عجیب ادا نے پورے علاقے کو تالابوں سے بھر دیا۔ اس کہانی کے کوئی سو تالاب آج بھی یہاں مل جائیں گے اور ان کی وجہ سے ہی اس علاقے میں آبی سطح عمدہ بنی ہوئی ہے۔ پوکھر اکثر چھوٹے تالاب کے لئے ہی کام آتا ہے، لیکن برسانے (متھرا) میں یہ ایک بڑے تالاب کے لئے بھی رائج ہے۔ رادھا جی کے ہاتھ کی ہلدی دھونے کا موقع ہے۔ پوکھر کا پانی پیلا ہو گیا، نام پڑ گیا پیلا پوکھر۔ رنگ سے مزہ پر آئیں۔ مہاراشٹر میں ایک تالاب کا پانی اتنا مزے دار ہے کہ اُس کا نام ہی چودار (चवदार) تال یعنی ذائقہ دار تالاب ہوگیا۔ سماج کے زوال کے دور میں اس تالاب پر کچھ برادریوں کے داخلہ پر پابندی لگ گئی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں چودار تال سے ہی بھیم راؤ جی امبیڈکر نے چھوت چھات کے خلاف تحریک شروع کی تھی۔

عجیب تالابوں میں کوہِ آبو (راجستھان) کے پاس نکھی سرودر بھی ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے دیوتاؤں اور رشیوں نے اپنے ناخنوں سے ہی کھود ڈالا تھا، جس سماج میں معمولی لوگ بھی تالاب بنانے میں پیچھے نہیں رہتے تھے، وہاں دیوتاؤں کا تعاون صرف ایک تالاب کا کیسے ہوتا؟ گڑھوال میں (सहस्त्रताल) سہستر تال نامی ایک علاقے میں سچ مچ سیکڑوں تالاب ہیں، ہمالیہ کا یہ علاقہ دس ہزار سے تیرہ ہزار فٹ کی اونچائی پر ہے۔ یہاں فطرت ایک جانب سبزہ کو خیر باد کہتی ہے، تو دوسری جانب برفباری کو خوش آمدید کرتی ہے۔ آس پاس دور دور تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ نزدیک ترین گاؤں پانچ ہزار فٹ نیچے ہے، جہاں کے لوگ بتاتے ہیں کہ سہستر تال انہوں نے نہیں دیوتاؤں نے ہی بنائے ہیں۔ جے پور کے پاس بنا ہوا گولا تال عجیب حادثوں میں سے نکلے تالابوں میں سچ مچ باتصویر بیان کیے جانے کے لائق ہے۔ یہ گول ہے

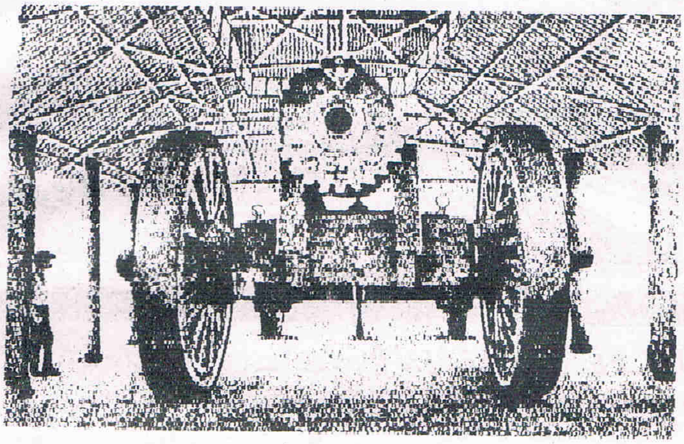

ای جے بانڑ نے داغا تھا گول تال

اس لئے گولا نہیں کہلاتا، کہا جاتا ہے کہ یہ ایک توپ کے گولے سے بنا تھا۔ تب جے پور شہر نہیں بسا تھا، آمیر راجدھانی تھی، قلعہ تھا جے گڑھ، جے گڑھ کے راجا نے جے بانڑ نامی ایک بڑی توپ بنائی تھی، اس کی مار بہت زیادہ تھی۔ اس کا گولا 20 میل کی دوری تک جا سکتا تھا، توپ جے گڑھ قلعے کے اندر ہی بنے توپ کارخانے میں ڈھلی تھی، اس کی مار کی جانچ کے لئے اسے قلعے کے ایک برج پر چڑھایا گیا اور گولا داغا گیا، گولا گرا 20 میل دور چاکسو نامی ایک مقام پر، دھماکا اتنا زبردست تھا کہ ایک لمبا چوڑا اور گہرا گڑھا بن گیا، اگلی برسات میں اس میں پانی بھرا اور پھر یہ کبھی سوکھا نہیں۔ اس طرح جے بانڑ توپ نے بنایا گولا تال، جے بانڑ توپ پھر کبھی چلی نہیں، جانچ کے بعد ہی امن قائم ہو گیا، کہتے ہیں اس کے بعد کسی نے اُس طرف حملہ کرنے کی ہمت نہیں کی، گولا تال آج بھی بھرا ہے اور چاکسو قصبے کو پانی دے رہا ہے۔ ایٹم بم یا کہیں ایٹمی طاقت کے پُر امن استعمال کی بات بہت ہوئی تھی، ہمارے یہاں بھی ہوئی، اسی راجستھان میں پوکرن میں اُس کا دھماکہ ہوا لیکن کوئی گولا تالاب نہیں بنا، بنتا تو جوہری تابکاری کی وجہ سے جو نقصان ہوتا وہ نہ بننے سے زیادہ ہوتا۔

کبھی کبھی کسی علاقے میں کوئی ایک تالاب لوگوں کے من میں باقی سب سے زیادہ چھا جاتا، تب اس کا نام جھومر تال ہو جاتا۔ جھومر ہے سر کا زیور، جھومر تال اُس علاقے کا سر اونچا کر دیتا، تب پیار میں جیسے بیٹی کو کبھی کبھی بٹیا کہنے لگتے ہیں، اُسے جھومری تلیا کہنے لگتے، بالکل مختلف موقع پر ایک جھومری تلیا کا نام وِودھ بھارتی کی وجہ سے گھر گھر پہنچ گیا تھا۔

بھارتی، زبان کا اختلاف، تال تلیوں کا یہ تنوع سماج کا دماغ اونچا کرتا تھا۔ ☆☆☆

سراب کو جھٹلاتے تالاب

دیش بھر میں پانی کا کام کرنے والا یہ دماغ ریگستان میں سراب سے گھر گیا تھا۔
سب سے گرم اور سب سے سوکھا علاقہ ہے یہ۔ سال بھر میں کوئی 3 سے 12 انچ پانی برستا ہے یہاں، جیسلمیر، باڑمیر اور بیکانیر کے کچھ حصوں میں کبھی کبھی پورے سال میں بس اتنا ہی پانی گرتا ہے جتنا ملک کے دیگر حصوں میں ایک دن میں گر جاتا ہے، سورج بھی یہاں سب سے زیادہ چمکتا ہے اور اپنی پوری تیزی کے ساتھ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گرمی کا موسم یہاں سے ملک بھر میں چکر لگا کر واپس یہیں جم جاتا ہے۔ درجہ حرارت 50 درجہ نہ چھولے تو ریگستان کے لوگوں کے دل میں اس کا وقار کم ہو جاتا ہے۔ زیر زمین پانی یہیں سب سے گہرا ہے، پانی کی کمی کو ہی ریگستان کا برتاؤ مانا جاتا ہے، لیکن یہاں کے سماج نے اسے ایک بددعا کی طرح نہیں، بلکہ قدرت کے ایک بڑے کھیل کے حصہ کی طرح دیکھا اور پھر وہ ایک ماہر کردار کی طرح سج دھج کر اس کھیل میں شامل ہو گیا۔

چاروں طرف سراب سے گھری ہوئی تپتی ہوئی ریتیلی زمین میں زندگی کی، ایک زندہ تہذیب کی بنیاد رکھتے وقت سماج نے پانی سے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات کو دیکھا، پرکھا ہوگا۔ پانی کے معاملے میں تمام ناموافق حالات میں اُس نے زندہ رہنے کا طریقہ تلاش کرنے کی کوشش کی اور سراب کو جھٹلاتے ہوئے جگہ جگہ مختلف قسم کے انتظامات کئے۔

جہاں تالاب نہیں، پانی نہیں، وہاں گاؤں نہیں، تالاب کا کام پہلے ہوگا، پھر اُس کو بنیاد بنا کر گاؤں بسے گا، ریگستانی زمین میں سیکڑوں گاؤں کا نام وہاں بنے ہوئے تالابوں سے جڑا ہے، بیکانیر ضلع کی بیکانیر تحصیل میں 64، کولیات تحصیل میں 20 اور نوکھا علاقہ میں 123 گاؤں کے نام 'سر' پر ہی ہیں، ایک تحصیل لون کرنسر کے نام میں ہی سر ہے اور یہاں دیگر 45 گاؤں کا نام سر پر رکھا گیا ہے، بچے ہوئے جن گاؤں کے نام میں سر نہیں ہے، اُن گاؤں میں بھی تالاب ضرور ملیں گے۔ ہاں دو چار ایسے بھی گاؤں ہیں، جن کے نام میں سر ہے لیکن وہاں سر وور نہیں ہے، گاؤں میں سر وور بن جائے، ایسی خواہش گاؤں کا نام رکھتے وقت ہی رہتی تھی، ٹھیک اُسی طرح جیسے بیٹے کا نام رام کمار، بیٹی کا نام پاروتی وغیرہ رکھتے وقت ماں باپ اپنی اولاد میں ان کی خوبیوں کی تمنا کر لیتے ہیں۔ زیادہ تر گاؤں میں کام پورا کر دیا جاتا اور جہاں کہیں کسی وجہ سے پورا نہ ہو پاتا، اُسے مستقبل قریب میں پورا ہوتے دیکھنے کی تمنا نے ریگزار کے سماج کو پانی کے معاملے میں ایک مضبوط

تنظیم میں ڈھال دیا تھا۔

راجستھان کے گیارہ ضلعوں - جیسلمیر، باڑمیر، جودھپور، پالی، بیکانیر، چُرو، شری گنگانگر، جھن جھنوں، جالور، ناگور اور سیکر میں ریگستان کا پھیلاؤ ملتا ہے، لیکن ریگستان اپنے کو سمیٹ کر گھنا بناتا ہے، جیسلمیر، باڑمیر اور بیکانیر میں۔ یہیں دیش کی سب سے کم بارش، سب سے زیادہ گرمی ہوتی ہے، ریت کی تیز آندھی ہے اور پنکھ لگا کر یہاں سے وہاں اُڑنے والے ریت کے عظیم ٹیلے (دھورے) ہیں، ان تین ضلعوں میں پانی سب سے زیادہ قیمتی ہونا چاہیے تھا، لیکن ریگستان کے ان گاؤں کا تجزیہ کرتے وقت مردم شماری کی رپورٹ کو بھی بھروسا نہیں ہو پاتا کہ یہاں صد فیصد گاؤں میں پانی کا انتظام ہے، اور یہ انتظام زیادہ تر گاؤں میں ریگستان کے سماج نے اپنے دم پر کیا تھا، یہ اتنا مضبوط تھا کہ اُن دیکھی کے جدید لمبے دور کے بعد بھی یہ کسی نہ کسی شکل میں ٹکا ہوا ہے۔

گزیٹیر میں جیسلمیر کا تذکرہ بہت ڈراونا ہے: 'یہاں ایک بھی بارہ ماسی ندی نہیں ہے، زیر زمین پانی 125 سے 240 فٹ اور کہیں کہیں تو 400 فٹ نیچے ہے۔ برسات غیر یقینی طور سے کم ہے، صرف 16.4 سینٹی میٹر، پچھلے 70 سالوں کے مطالعہ کے مطابق سال کے 365 دنوں میں سے 355 دن سوکھے گنے گئے ہیں، یعنی 120 دن کا موسم باراں یہاں اپنی مختصر شکل میں صرف 10 دن کے لئے آتا ہے۔'

لیکن یہ سارا حساب کتاب کچھ نئے لوگوں کا ہے، ریگستان میں سماج نے ممکنہ طور پر 10 دن کی بارش میں کروڑوں بوندوں کو دیکھا اور پھر اُن کو اکٹھا کرنے کا کام گھر گھر، گاؤں گاؤں اور اپنے شہروں تک میں کیا، اس محنت کا نتیجہ سامنے ہے:

جیسلمیر ضلع میں آج 515 گاؤں ہیں، ان میں 53 گاؤں کسی نہ کسی وجہ سے اُجڑ چکے ہیں، آباد ہیں 462۔ ان میں سے صرف ایک گاؤں کو چھوڑ کر ہر گاؤں میں پینے کے پانی کا انتظام ہے، اُجڑ چکے گاؤں تک میں یہ انتظام قائم ملتا ہے۔ سرکار کے اعداد و شمار کے مطابق جیسلمیر کے 99.78 فیصد گاؤں میں تالاب، کنویں اور دیگر ذرائع ہیں، ان میں نل، ٹیوب ویل جیسے نئے انتظام کم ہی ہیں۔ پتا نہیں 1.73 فیصد گاؤں کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ لیکن اس سرحدی ضلع کے 515 گاؤں میں سے 'اتنے' ہی گاؤں میں بجلی ہے، اس کا مطلب ہے کہ بہت سی جگہ ٹیوب بجلی سے نہیں، ڈیزل، تیل سے چلتے ہیں۔ تیل باہر دور سے آتا ہے، تیل کا ٹینکر نہ آپائے تو پمپ نہیں چلیں گے، پانی نہیں ملے گا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھیک چلتا رہا تو آگے پیچھے ٹیوب ویل سے سطح آب گھٹے گی، اُسے جہاں کے تہاں تھامنے کا کوئی طریقہ ابھی تو ہے نہیں۔

ایک بار پھر دہرا لیں کہ ریگستان کے سب سے زیادہ ہوش اُڑا دینے والے اس علاقے میں

99.78 فیصد گاؤں میں پانی کا انتظام ہے اور اپنے دم پر ہے۔ اسی کے ساتھ اُن احتیاطوں کو دیکھیں جنہیں برتنا نئے سماج کے نئے اداروں، خاص طور سے سرکار کی ذمہ داری مانی جاتی ہے، پکّی سڑکوں سے ابھی تک صرف 19 فیصد گاؤں جڑ پائے ہیں، ڈاک وغیرہ کی آسانی 30 فیصد تک پھیل پائی ہے، علاج وغیرہ کی دیکھ ریکھ 9 فیصد تک پہنچ سکی ہے، تعلیم کی سہولت ان سب کے مقابلے میں تھوڑی بہتر ہے۔ 50 فیصد گاؤں میں، پچھڑے پانی پر آئیں۔ 515 گاؤں میں 675 کنویں اور تالاب ہیں، اس میں تالابوں کی تعداد 294 ہے۔ جسے نئے لوگوں نے ناامیدی کا علاقہ مانا وہاں سرحد کے کنارے پر، پاکستان سے تھوڑا پہلے آسوتال یعنی آس (امید) کا تال ہے۔ جہاں درجہ حرارت 50 درجہ کو چھو لیتا ہے وہاں ستلائی (सितलाई) یعنی شیتل تلائی ہے اور جہاں بادل سب سے زیادہ 'دھوکا' دیتے ہیں وہاں 'بدراسر' بھی ہیں، لیکن ایسی بات نہیں ہے کہ ریگستان میں پانی کی مشکل نہیں رہی ہو لیکن یہاں سماج نے اُس پریشانی کا رونا نہیں رویا۔ اُس نے اس پریشانی کو کچھ آسان بنا لینے کی امید رکھی اور اُس امید کی بنیاد پر اپنے کو اس طرح کی تنظیم میں ڈھال لیا کہ ایک طرف پانی کی ہر بوند کو جمع کیا اور دوسری جانب اُس کا استعمال خوب کفایت اور سمجھداری سے کیا۔

جمع کرنے اور کفایت شعاری کے اس مزاج کو نہ سمجھ پانے والے گزیٹیر اور جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں، اُس راج اور سماج کو یہ علاقہ ویران اور قبرستان نظر آتا ہے، لیکن گزیٹیر میں یہ سب لکھ جانے والا بھی جب گھڑسیسر (घड़सीसर) پہنچا ہے تو ''وہ بھول جاتا ہے کہ وہ ریگستان کے سفر پر ہے۔''

کاغذ پر سیاحت کے نقشوں میں جتنا بڑا شہر جیسلمیر ہے، لگ بھگ اُتنا ہی بڑا تالاب گھڑسیسر ہے، کاغذ کی طرح ریگستان میں بھی یہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے کھڑے ہیں۔ بغیر گھڑسیسر کے جیسلمیر نہیں ہوتا۔ لگ بھگ 800 برس پرانے اس شہر کے کوئی 700 برس، اُس کا ایک ایک دن گھڑسیسر کی ایک ایک بوند سے جڑا رہا ہے۔

ریت کا ایک عظیم ٹیلہ سامنے کھڑا ہے، پاس پہنچنے پر بھی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ یہ ٹیلہ نہیں، گھڑسیسر کی اونچی، پوری، لمبی چوڑی پال ہے۔ ذرا اور آگے بڑھیں تو دو برج اور پتھر پر خوبصورت نقاشی کے پانچ کھرونچوں اور دو چھوٹے اور ایک بڑے پول (آنگن) کا داخلہ دروازہ سر اٹھائے کھڑا دکھائی دے گا۔ بڑے اور چھوٹے صحن کے سامنے نیلا آسمان جھلکتا نظر آتا ہے، جیسے جیسے قدم آگے بڑھتے جاتے ہیں، داخلہ دروازہ سے نظر آنے والی جھلک میں نئے نئے منظر جڑتے جاتے ہیں، یہاں تک پہنچ کر سمجھ میں آئے گا کہ پول سے جو نیلا آسمان نظر آ رہا تھا، وہ تو سامنے پھیلا نیلا پانی ہے، پھر دائیں بائیں جانب خوبصورت پکّے گھاٹ، مندر، پتھر کا فرش، بارہ دری، متعدد ستونوں سے سجے برآمدے، کمرے اور نہ جانے کیا کیا جڑ جاتا ہے، ہر لمحہ بدلنے

والے منظر پر جب تالاب کے پاس پہنچ کر سکون ہوتا ہے، تب آنکھیں سامنے نظر آنے والے خوبصورت منظر پر کہیں ایک جگہ ٹک نہیں پاتیں، ہر لمحہ پتلیاں گھوم گھوم کر اُس عجیب منظر کو ناپ لینا چاہتی ہیں۔

لیکن آنکھیں اسے ناپ نہیں پاتیں، تین میل لمبے اور کوئی ایک میل چوڑے آگر والے اس تالاب کا آگور 120 مربع میل رقبہ میں پھیلا ہوا ہے، اسے جیسلمیر کے راجا مہاراول گھڑسی نے وکرم سن 1391 یعنی ۱۳۳۵ء میں بنوایا تھا۔ دوسرے راجا تالاب بنوایا کرتے تھے، لیکن گھڑسی نے تو اسے خود بنایا تھا۔ مہاراول روز اونچے قلعے سے اُتر کر یہاں آتے اور کھدائی، بھرائی وغیرہ ہر ایک کام کی دیکھ ریکھ کرتے۔ یوں وہ دور جیسلمیر راج کے لئے بھاری اُتھل پتھل کا دور تھا۔ بھائی ونش گدی کی چھینا جھپٹی کے لئے اندرونی لڑائی، سازش اور سنگھرش سے گزر رہا تھا، ماما اپنے بھانجے پر گھات لگا کر حملہ کر رہا تھا، سگے بھائی کو دیش نکالا دیا جا رہا تھا تو کہیں کسی کے پیالے میں زہر گھولا جا رہا تھا، شاہی گھرانے میں آپسی جنگ تو تھی ہی، اُدھر راج اور شہر جیسلمیر بھی چاہے جب دیسی - پردیسی حملہ آوروں سے گھر جاتا تھا اور جب تب بہادر مرد شہید ہوتے اور عورتیں خودکشی کے شعلوں میں اپنے کو خاک کر دیتیں۔

ایسے شعلہ بار دور میں خود گھڑسی نے راٹھوروں کی فوج کی مدد سے جیسلمیر پر قبضہ کیا تھا، تاریخ کی کتابوں میں گھڑسی کا زمانہ فتح وشکست، عظمت و ہزیمت، موت اور جنگ کا میدان جیسے الفاظ سے بھرا پڑا ہے، تب بھی یہ ساگر بن رہا تھا، برسوں کے اس منصوبہ پر کام کرنے کے لئے گھڑسی نے بے حد ضبط سے کام لیا اور بے انتہا وسائل مہیا کیے اور پھر اس کی سب سے بڑی قیمت بھی چکائی تھی - پال بن رہی تھی، مہاراول پال پر کھڑے ہو کر سارا کام دیکھ رہے تھے، راج خاندان میں چل رہی اندرونی سازش نے پال پر کھڑے گھڑسی پر مہلک حملہ کیا، راجا کی چتا پر رانی کا ستی ہو جانا اُس وقت کا رواج تھا، لیکن رانی وِملا ستی نہیں ہوئی، راجا کا خواب رانی نے پورا کیا۔

ریت کے اس خواب میں دو رنگ ہیں، نیلا رنگ ہے پانی کا اور پیلا رنگ ہے تین چار میل کے تالاب کی کوئی آدھی گولائی میں بنے گھاٹ، مندروں، برجوں اور بارہ دری کا، لیکن یہ خواب دن میں دو بار بس صرف ایک ہی رنگ میں نظر آتا ہے، اُگتے اور ڈوبتے وقت سورج گھڑسی سر میں من بھر پگھلا ہوا سونا انڈیل دیتا ہے، من بھر یعنی ناپ تول والا من نہیں، سورج کا من بھر جائے اتنا۔

لوگوں نے بھی گھڑسیسر میں اپنی اپنی حیثیت سے سونا ڈالا تھا، تالاب راجا کا تھا لیکن پرجا اُسے سنوارتی، سجاتی چلی گئی۔ پہلے دور میں بنے ہوئے مندر، گھاٹ اور جل محل کی توسیع ہوتی گئی، جسے جب بھی جو کچھ اچھا سوجھا، اُسے گھڑسی سر میں نچھاور کر دیا، گھڑسی سر راجا - پرجا کی اُس جوڑی داری میں ایک انوکھا

گیت بن گیا تھا۔

ایک وقت گھاٹ پر پاٹھ شالائیں بھی بنیں، ان میں شہر اور آس پاس کے گاؤں کے بچے آ کر رہتے تھے اور وہیں گرو سے گیان حاصل کرتے تھے۔ پال پر ایک طرف چھوٹے چھوٹے باورچی خانے اور کمرے بھی ہیں، دربار میں، کچہری میں جن کا کوئی کام اٹکتا، وہ گاؤں سے آ کر یہیں ڈیرا جماتے، نیل کنٹھ اور گردھاری کے مندر بنے، یگ شالہ بنی، جمال شاہ پیر کی چوکی بنی، سب ایک گھاٹ پر، کام دھندے کے سبب ریگستان چھوڑ کر دیش میں کہیں اور جا بسنے والے خاندانوں کا من بھی گھڑسیسر میں اٹکا رہتا۔ اسی علاقے سے مدھیہ پردیش کے جبل پور میں جا کر بس رہنے والے سیٹھ گوند داس کے پرکھوں نے یہاں لوٹ کر ''پٹھ سال'' پر ایک عظیم مندر بنوایا تھا۔ پانی تو شہر بھر کا یہیں سے جاتا تھا، یوں تو دن بھر یہاں سے پانی بھرا جاتا لیکن صبح اور شام تو سیکڑوں پنہارنوں کا میلا لگتا، یہ منظر شہر میں نل لگنے سے پہلے تک رہا ہے، ۱۹۹۱ء میں گھڑسیسر پر امید سنگھ جی مہتا کی ایک غزل ایسے مناظر کا بہت خوبصورت بیان کرتی ہے۔ بھادوں کی کجلی - تیج کے میلے پر سارا شہر سج دھج کر گھڑسیسر آ جاتا، صرف نیلے اور پیلے رنگ کے اس تالاب میں تب قدرت کے سب رنگ چھٹک جاتے۔

گھڑسی سر سے لوگوں کا پریم یک طرفہ نہیں تھا، لوگ گھڑسی سر آتے اور گھڑسی سر بھی لوگوں تک جاتا تھا اور اُن کے من میں بس جاتا، دور سندھ میں رہنے والی ٹیلوں نامی ریاضی داں کے دل نے یقیناً ایسے ہی کسی لمحہ میں کچھ فیصلے کیے تھے۔

تالاب پر مندر، گھاٹ - پاٹ سبھی کچھ تھا، ٹھاٹ میں کوئی کمی نہیں تھی، پھر بھی ٹیلوں کو لگا کہ اتنے سنہرے سرووَر کا ایک سنہرا داخلہ دروازہ بھی ہونا چاہیے، ٹیلوں نے گھڑسی سر کے مغربی گھاٹ پر 'پول' یعنی داخلہ دروازہ بنانا طے کر لیا، پتھر پر باریک نقاشی والے خوبصورت جھروکوں سے آراستہ عظیم داخلہ دروازہ ابھی پورا ہو ہی رہا تھا کہ کچھ لوگوں نے مہاراج کے کان بھرے، ''کیا آپ ایک ریاضی داں کے ذریعہ بنائے گئے داخلہ دروازے سے گھڑسیسر میں داخل ہوا کریں گے۔'' مخالفت شروع ہوگئی، اُدھر دروازے پر کام چلتا رہا، ایک دن راجا نے اسے گرانے کا فیصلہ کر لیا، ٹیلوں کو خبر لگی، راتوں رات ٹیلوں نے داخلہ دروازہ کے سب سے اونچی منزل میں مندر بنوا دیا۔ مہاراوال نے اپنا فیصلہ بدلا، تب سے پورا شہر اسی خوبصورت پول سے تالاب میں داخل ہوتا ہے اور بڑے جتن سے اسے ٹیلوں کے نام سے ہی یاد رکھے ہوئے ہے۔ ٹیلوں کی پول کے ٹھیک سامنے تالاب کی دوسری طرف شہر پناہ کی طرح کا ایک گول برج ہے، تالابوں کے باہر تو امرائی، باغیچے وغیرہ ہی ہیں لیکن اس برج میں تالاب کے اندر بغیچہ (बगीची) بنی ہے، جس میں لوگ گوٹ کرنے، یعنی آنند

پہلے پانی پھر اناج سے بھرتا ہے جیت سر

منگل منانے آتے رہتے تھے، اسی کے ساتھ مشرق میں ایک اور بڑا گول پرکوٹا ہے، اس میں تالاب کی حفاظت کرنے والی فوج کی ٹکڑی رہتی تھی، دیسی پردیسی دشمنوں سے گھرا راج پوری آبادی کو پانی دینے والے اس تالاب کی حفاظت کا بھی پختہ انتظام تھا۔

ریگستان میں پانی کتنا بھی کم برستا ہو، گھڑسی سر کا آگور اپنی اصل شکل میں اتنا بڑا تھا کہ وہ وہاں کی ایک ایک بوند کو سمیٹ کر تالاب کو لبالب بھر دیتا تھا، تب تالاب کی رکھوالی فوج کی ٹکڑی کے ہاتھ سے نکل کر نیشتا کے ہاتھ میں آجاتی، نیشتا چلتا اور اتنے عظیم تالاب کو توڑ سکنے والے اضافی پانی کو باہر بہانے لگتا، لیکن یہ 'بہانا' بھی بہت عجیب تھا، جو لوگ ایک ایک بوند اکھٹی کر کے گھڑسی سر بھرنا جانتے تھے، وہ اُس کے اضافی پانی کو صرف پانی نہیں پانی کا خزانہ مانتے تھے۔ نیشتا سے نکلا ہوا پانی آگے ایک اور تالاب میں جمع کر لیا جاتا تھا، نیشتا تب بھی نہیں رکتا تو اس تالاب کا نیشتا بھی چلنے لگتا، پھر اس سے بھی ایک اور تالاب بھر جاتا، اس سلسلہ آسانی سے بھروسا نہیں ہوگا مگر یہ پورے نو تالابوں تک چلتا رہتا، نوتال، گووندسر، جوشی سر، گلاب سر، بھاٹی سر، سُد اسر، رتن سر اور پھر کسان گھاٹ۔ یہاں تک پہنچنے پر بھی پانی بچتا تو کسان گھاٹ کے بعد اُسے کئی بیریوں میں یعنی چھوٹے چھوٹے کنویں نما گڑھوں میں بھر کر رکھ لیا جاتا۔ پانی کی ایک ایک بوند جیسے لفظ اور جملے گھڑسیسر سے کسان گھاٹ تک کے سات میل لمبے علاقے میں اپنا ٹھیک مطلب پاتے تھے۔

لیکن آج جن کے ہاتھ میں جیسلمیر ہے، حکومت ہے، وہ گھڑسی سر کا ہی مطلب بھو چلے ہیں تو اُس کے نیشتا سے جڑے نو تالابوں کی یاد انہیں بھلا کیسے رہے گی! گھڑسی سر کے آگور میں فضائی فوج کی طیران گاہ بن گئی ہے، اس لئے آگور کے اس حصہ کا پانی اب تالاب کی جانب نہ آ کر کہیں اور بہہ جاتا ہے، نیشتا اور اُس کے راستے میں پڑنے والے نو تالابوں کے آس پاس بے ترتیب بڑھتے ہوئے شہر کے مکان، نئی ہاؤسنگ

سوسائٹیاں اور تو اور پانی کا ہی نیا کام کرنے والی اندرا نہر اتھارٹی کا دفتر۔ اس میں کام کرنے والوں کی کالونی بن گئی ہے۔ گھاٹ، پٹھسال، پاٹھ شالائیں، باورچی خانے، برآمدے، مندر ٹھیک دیکھ بھال کی کمی سے ٹوٹ چلے ہیں۔ آج شہر لہاس کا وہ کھیل بھی نہیں کھیلتا جس میں راجا پرجا سب مل کر گڑھسی سر کی صفائی کرتے تھے، گاد نکالتے تھے۔ تالاب کے کنارے قائم پتھر کا آبی سطح کا ستون بھی تھوڑا سا ہل کر ایک طرف جھک گیا ہے، رکھوالی کرنے والی فوج کی ٹکڑی کے برج کے پتھر بھی ڈھ گئے ہیں۔

پھر بھی 668 برس پرانا گھڑسیسر مرا نہیں ہے، بنانے والوں نے اسے وقت کے تھپیڑے سہہ جانے کے لائق مضبوطی دی تھی۔ ریت کی آندھیوں کے بیچ اپنے تالابوں کی عمدہ دیکھ ریکھ کی روایت ڈالنے والوں کو شاید اس کا اندازہ نہیں تھا کہ کبھی ان دیکھی کی آندھی بھی چلے گی۔ لیکن اس آندھی کو بھی گھڑسیسر اور اسے آج بھی چاہنے والے لوگ بہت صبر کے ساتھ برداشت کر رہے ہیں۔ تالاب پر پہرا دینے والی فوجی ٹکڑی آج چاہے نہیں ہو، لیکن لوگوں کے من کا پہرا آج بھی ہے۔

پہلی کرن کے ساتھ مندروں کی گھنٹیاں بجتی ہیں، دن بھر لوگ گھاٹوں پر آتے جاتے ہیں، کچھ لوگ یہاں گھنٹوں مون بیٹھے بیٹھے گھڑسی سر کو دیکھتے رہتے ہیں تو کچھ گیت گاتے اور راون ہتھا (रावन हत्था)، ایک طرح کی سارنگی بجاتے ہوئے ملتے ہیں۔

پنہارنیں آج بھی گھاٹ پر آتی ہیں، پانی اونٹ گاڑیوں سے بھی جاتا ہے اور دن میں کئی بار ایسا ٹینکر گاڑیاں بھی یہاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں جن میں گھڑسی سر سے پانی بھرنے کے لئے ڈیزل پمپ تک لگا رہتا ہے، گھڑسی سر آج بھی پانی دے رہا ہے اور اسی لئے سورج آج بھی اُگتے اور ڈوبتے وقت گھڑسی سر میں من بھر سونا انڈیل جاتا ہے۔

گھڑسیسر ایک معیار بن چکا تھا، اس کے بعد کسی اور تالاب کو بنانا بہت مشکل رہا ہوگا، لیکن جیسلمیر میں ہر سو پچاس برس کے فرق سے تالاب بنتے رہے، ایک سے ایک معیاری ہونے کے ساتھ موتی کی طرح گتھے ہوئے۔ گھڑسی سر کے کوئی 175 برس بعد بنا تھا جیت سر (जैतसर)، یہ تھا تو باندھ نما تالاب ہی لیکن اپنے بڑے باغیچے کی وجہ سے بعد میں اسے 'بڑا باغ' کی طرح ہی یاد رکھا گیا، اس پتھر کے باندھ نے جیسلمیر کے شمال کی طرف کھڑی پہاڑیوں سے آنے والا پانی روک لیا ہے، ایک طرف جیت سر ہے اور دوسری طرف اسی پانی سے سینچا گیا بڑا باغ ہے، دونوں کو تقسیم کرتی ہے باندھ کی دیوار، لیکن یہ دیوار نہیں، اچھی خاصی چوڑی سڑک ہے جو گھاٹی پار کر کے سامنے کی پہاڑی تک جاتی ہے، دیوار کے نیچے بنی سینچائی نالی کا نام ہے رام نال، رام نال نہر باندھ کی طرف سیڑھی نما ہے، جیت سر میں پانی کی سطح زیادہ ہو یا کم، نہر کا سیڑھی نما ڈھانچہ پانی کو

بڑے باغ کی طرف اُتارتا رہتا ہے۔ بڑا باغ میں پہنچنے پر رام نال رام نام کی طرح کرن کرن میں تقسیم ہو جاتی ہے، نہر کے پہلے سرے پر ایک کنواں بھی ہے، پانی سوکھ جائے، نہر بند ہو جائے تو رِسن سے بھرے ہوئے کنویں کا استعمال ہونے لگتا ہے، اُدھر باندھ کے اُس پار آگر کا پانی سوکھتے ہی اُس میں گیہوں بو دیا جاتا ہے، تب باندھ دیوار کی دونوں جانب بس ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔

ہرا باغ سچ مچ بہت بڑا ہے، عظیم اور اونچے آم کے درختوں کا جھنڈ اور اس کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے پیڑ پودے، زیادہ بارش والے علاقوں میں، وہاں بھی اکثر ندی کے کنارے ملنے والا ارجن کا پیڑ بھی بڑا باغ میں مل جائے گا۔ بڑا باغ میں سورج کی کرنیں پیڑوں کی پتیوں میں اٹکی رہتی ہیں، ہوا چلے، پتیاں ہلیں تو موقع پا کر کرنیں نیچے چھن چھن کر ٹپکتی رہتی ہیں۔ باندھ کے اُس پار پہاڑیوں پر راج گھرانے کا شمشان ہے۔ یہاں اُن کے متوفیوں کی یاد میں لاتعداد خوبصورت چھتریاں بنی ہیں۔

امر ساگر گھڑسیسر سے 325 سال بعد بنا، کسی اور سمت میں برسنے والے پانی کو روکنا خاص سبب رہا ہوگا، لیکن امر ساگر بنانے والے ممکنہ طور پر یہ بھی جتانا چاہتے تھے کہ کارآمد اور خوبصورت تالابوں کو بناتے رہنے کی خواہش زندہ ہے۔ پتھر کے ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر کتنا بے جوڑ تالاب بن سکتا ہے۔ امر ساگر اس کی انوکھی مثال ہے۔ تالاب کی چوڑائی کی ایک جانب سیدھی کھڑی اونچی دیوار سے بنائی گئی ہے، دیوار پر جڑی ہوئی خوبصورت سیڑھیاں جھروکوں اور برج میں سے ہوتی ہوئی نیچے تالاب میں اُترتی ہیں۔ اسی دیوار کے بڑے سپاٹ حصہ میں الگ الگ اونچائی پر پتھر کے ہاتھی گھوڑے بنے ہیں، یہ خوبصورت سجی دھجی مورتیاں تالاب کی آبی سطح بتاتی ہیں، امر ساگر کا آگور اتنا بڑا نہیں ہے کہ وہاں سے سال بھر کا پانی جمع ہو جائے، گرمی آتے آتے تالاب سوکھنے لگتا ہے، اس کا مطلب تھا کہ جیسلمیر کے لوگ اتنے خوبصورت تالاب کو اُس موسم میں بھول جائیں، جس میں پانی کی سب سے زیادہ ضرورت رہتی ہے!

تالاب کے کنارے بنتے ہیں کنویں

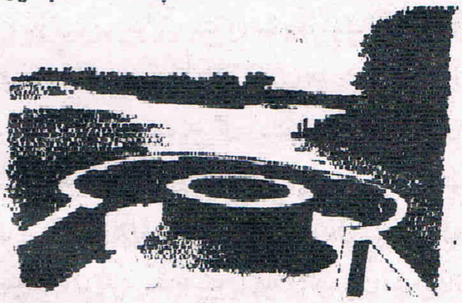

جیسلمیر کے سنگ تراشوں نے یہاں کچھ ایسے کام کیے، جن سے فن سنگ تراشی میں کچھ نئے صفحات جڑ سکتے ہیں، یہاں تالاب کی تہہ میں سات خوبصورت بیریاں بنائی گئی ہیں، بیری یعنی ایک طرح کی باوڑی، یہ

پگباؤ (पगबाव) بھی کہلاتی ، پگباؤ لفظ پگ واہ سے بنا ہے، واہ یا بائے یا باؤڑی، پگ باؤ یعنی جس میں پانی تک پگ ، پگ پیدل ہی پہنچا جاسکے، تالاب کا پانی سوکھ جاتا ہے، لیکن اُس کے رساؤ سے زمین کی سطح آب اوپر اُٹھ جاتی ہے۔ اسی صاف چھنے پانی سے بیریاں بھری رہتی ہیں، بیریاں بھی ایسی بنی ہیں کہ موسم گرما میں اپنا پانی کھو بیٹھا امر ساگر اپنی خوبصورتی نہیں کھودیتا، سبھی بیریوں پر پتھر کے خوبصورت چبوترے ، ستون، چھتریاں اور نیچے اُترنے کے لئے فنکارانہ سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں، گرمی میں، بیساکھ میں بھی میلا بھرتا ہے اور برسات میں، بھادوں میں بھی، سوکھے امر ساگر میں یہ چھتری دار بیریاں کسی محل کے ٹکڑے جیسی لگتی ہیں اور جب یہ بھر جاتا ہے تو لگتا ہے کہ تالاب میں چھتری دار بڑی بڑی کشتیاں تیر رہی ہیں۔ جیسلمیر ریگستان کا ایک ایسا راج رہا ہے جس کا کاروباری دنیا میں ڈنکا بجتا تھا، پھر مندی کا دور بھی آیا لیکن جیسلمیر اور اُس کے آس پاس تالاب بنانے کا کام سست نہیں پڑا، گجروپ ساگر، مول ساگر، گنگا ساگر، گلاب تالاب اور ایسر لال جی کا تالاب- ایک کے بعد ایک تالاب بنتے چلے گئے، یہ کڑی انگریزوں کے آنے تک ٹوٹی نہیں تھی۔ اس کڑی کی مضبوطی صرف راجاؤں، راولوں، مہاراولوں پر ہی منحصر نہیں تھی، سماج کے وہ اجزا بھی، جو آج کی تعریف میں اقتصادی طور سے کمزور مانے جاتے ہیں، تالابوں کی کڑی کو مضبوط بنائے رکھتے تھے۔

میگھا ڈھور چرایا کرتا تھا، یہ قصہ 500 برس پہلے کا ہے، جانوروں کے ساتھ میگھا علی الصباح نکل جاتا، کوسوں تک پھیلا سپاٹ ریگستان، میگھا دن بھر کا پانی اپنے ساتھ ایک کپڑی (कुपड़ी) مٹی کی چپٹی صراحی میں لے جاتا، شام واپس لوٹتا، ایک دن کپڑی میں تھوڑا سا پانی بچ گیا، میگھا کو نہ جانے کیا سوجھا، اُس نے چھوٹا سا گڈھا کیا، اُس میں کپڑی کا پانی ڈالا اور آک کے پتوں سے گڈھے کو اچھی طرح ڈھک دیا، چرائی کا کام آج یہاں، کل کہیں اور، میگھا دو دن تک اُس جگہ پر نہیں جاسکا، وہاں وہ تیسرے دن پہنچ پایا، متجسس ہاتھوں نے آک کے پتے ہٹائے، گڈھے میں پانی تو نہیں تھا لیکن ٹھنڈی ہوا آئی، میگھا کے منھ سے لفظ نکلا- 'بھاپ' - میگھا نے سوچا کہ یہاں اتنی گرمی میں تھوڑی سے پانی کی نمی بچی رہ سکتی تو پھر یہاں تالاب بھی بن سکتا ہے۔

میگھا نے اکیلے ہی تالاب بنانا شروع کیا۔ اب وہ روز اپنے ساتھ کدال تگاڑی بھی لاتا، دن بھر اکیلے مٹی کھودتا اور پال پر ڈالتا، گائیں بھی وہیں آس پاس چرتی رہتیں، بھیم جیسی طاقت نہیں تھی، لیکن بھیم کی طاقت جیسا عظم تھا میگھا کے پاس، دو سال تک وہ اکیلے ہی لگا رہا، سپاٹ ریگستان میں پال کا عظیم گھیرا اب دور سے ہی نظر آنے لگا تھا، پال کی خبر گاؤں کو بھی لگی۔

اب روز صبح گاؤں سے بچے اور دوسرے لوگ بھی میگھا کے ساتھ آنے لگے، سب مل کر کام کرتے،

12 سال ہو گئے تھے، اب بھی عظیم تالاب پر کام چل رہا تھا، لیکن میگھا کی عمر پوری ہو گئی۔ پتنی ستی نہیں ہوئی، اب تالاب پر میگھا کے بدلے وہ کام کرنے آتی۔ 6 مہینے میں تالاب پورا ہوا۔

بھاپ کے سبب بننا شروع ہوا تھا، اس لئے اس جگہ کا نام بھی بھاپ پڑا جو بعد میں بگڑ کر باپ ہو گیا۔ چرواہے میگھا کو، سماج نے میگھو جی کی طرح یاد رکھا اور تالاب کی پال پر ہی اُن کی خوبصورت چھتری اور اُن کی پتنی کی یاد میں وہیں ایک چھوٹا سا مندر بنا دیا۔ باپ بیکانیر۔ جیسلمیر کے راستے میں پڑنے والا چھوٹا سا قصبہ ہے۔ چائے اور کچوری کی 7-5 دکانوں والا بس اسٹینڈ ہے، بسوں سے تین گنی اونچی پال بس اسٹینڈ کی بغل میں کھڑی ہے۔ مئی جون میں پال کے اس طرف لو چلتی ہے، اُس طرف میگھو جی کے تالاب میں لہریں اٹھتی ہیں، برسات کے دنوں میں تو تالاب میں لاکھے ٹا (डाप) 'لگ' جاتا ہے۔ تب پانی 4 میل میں پھیل جاتا ہے۔

میگھ (بادل) اور میگھ راج چاہے یہاں کم آتے ہوں، لیکن ریگستان میں میگھو جی جیسے لوگوں کی کمی نہیں رہی، پانی کے معاملے میں اتنا معاون سماج اپنی معاونت کو، فن اور صلاحیت کو اپنا بتا کر غرور نہیں کرتا، وہ عاجزی کے ساتھ اس کا پورا سہرا بھگوان کو سونپ کر سر جھکا لیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ مہابھارت کی جنگ ختم ہو جانے کے بعد شری کرشن کروکشیتر سے ارجن کو ساتھ لے کر دوارکا جا رہے تھے۔ ان کا رتھ ریگستانی علاقہ پار کر رہا تھا، آج کے جیسلمیر کے پاس ترکوٹ پہاڑی پر انہیں (उत्तंग) اتنگ رشی تپسیا کرتے ہوئے ملے، شری کرشن نے انہیں پرنام کیا اور پوچھا "کیا مانگتے ہو"، اتنگ (उत्तंग) کا مطلب ہے اونچا، سچ مچ رشی اونچے تھے، انہوں نے اپنے لئے کچھ نہیں مانگا، انہوں نے پربھو سے استدعا کی کہ اگر میری کچھ نیکیاں ہیں تو بھگوان ایسی برکت عطا کریں کہ اس علاقے میں کبھی پانی کی کمی نہ رہے۔

ریگستانی زمین کے سماج نے اس عطیہ کو ایک حکم کی طرح لیا اور اپنے فن سے سراب کو جھٹلا دیا۔

☆☆☆☆

تالاب باندھتا مذہبی مزاج

جو معاشرہ کو زندگی دے، اُسے بے جان کیسے مانا جا سکتا ہے؟ تالابوں میں، آبی وسائل میں زندگی مانی گئی اور سماج نے ان کے چاروں طرف اپنی زندگی کو رچا بسا ہے۔ جس کے ساتھ جتنا قریبی تعلق، جتنا پیار ہوتا ہے دل اس کے اتنے ہی نام رکھ لیتا ہے۔ ملک کے الگ الگ صوبوں میں، زبانوں میں، بولیوں میں تالاب کے کئی نام ہیں۔ بولیوں کے خزانہ میں اُن کی قواعد کی کتابوں میں، ہم معنی لفظوں کی فہرست میں تالاب کے ناموں کا ایک بھرا پورا خاندان دیکھنے کو ملتا ہے۔ ڈنگل زبان کی گرامر کا ایک گرنتھ ہمیر نام- مالا تالابوں کے ہم معنی نام تو گنتا ہی ہے۔ ساتھ ہی اُن کے مزاج کا بھی بیان کرتے ہوئے تالابوں کو 'دھرم سو بھاؤ' کہتا ہے۔

عوامی مذہب مزاج سے جڑ جاتا ہے، ساتھ سکھ کا ہو تو تالاب بن جائے گا، ساتھ دُکھ کا بھی ہو تو تالاب بن جائے گا۔ جیسلمیر، باڑمیر میں خاندان میں وسائل کم ہوں، پورا تالاب بنانے کی گنجائش نہ ہو تو ان محدود وسائل کا استعمال پہلے سے بنے ہوئے کسی تالاب کی پال پر مٹی ڈالنے۔ چھوٹی موٹی مرمت کرنے میں ہوتا تھا۔ موت کس خاندان میں نہیں ہوتی؟ ہر خاندان اپنے غم کو سماج کے سکھ کے لئے تالاب سے جوڑ دیتا تھا۔

پورا سماج دکھ میں مبتلا ہوتا، قحط پڑتا تب بھی تالاب بنانے کا کام ہوتا۔ لوگوں کو فوراً راحت ملتی اور پانی کا انتظام ہونے سے بعد میں پھر کبھی آسکنے والے اس دکھ کو سہہ سکنے کی طاقت سماج میں پیدا ہوتی تھی۔ بہار کے مدھوبنی علاقے میں چھٹی صدی میں آئے ایک بڑے قحط کے وقت پورے علاقے کے گاؤں نے مل کر 63 تالاب بنائے تھے۔ اتنا بڑا منصوبہ بنانے سے لے کر اسے پورا کرنے تک کے لئے کتنی بڑی تنظیم بنی ہوگی؟ کتنے وسائل مہیا کیے گئے ہوں گے۔ نئے لوگ، نئی سماجی اور سیاسی تنظیمیں اس پر غور تو کریں، مدھوبنی میں یہ تالاب آج بھی ہیں اور لوگ انہیں آج بھی شکرگزاری سے یاد رکھے ہوئے ہیں۔

کہیں انعام کی طرح تالاب بنا دیے جاتے، تو کہیں تالاب بنانے کا انعام ملتا، گونڈ راجاؤں کی سرحد میں جو بھی تالاب بناتا، اُسے اُس کے نیچے کی زمین کا لگان نہیں دینا پڑتا تھا۔ سنبل پور علاقے میں یہ رسم خاص طور سے ملتی تھی۔

تعزیرات میں بھی تالاب ملتا ہے، بندیل کھنڈ میں پنچایتیں اپنے کسی ممبر کی غلطی پر سزائے جرمانے میں اکثر تالاب بنانے کو کہتی تھیں، یہ رواج راجستھان میں آج بھی ملتا ہے۔ الور ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں گوپال پورا میں پنچایتی فیصلوں کو نہ ماننے کی غلطی کرنے والوں سے سزا کے طور پر کچھ رقم گاؤں کے فنڈ

میں جمع کروائی جاتی تھی، اُس فنڈ سے یہاں پچھلے دنوں دو چھوٹے چھوٹے تالاب بنائے گئے ہیں۔

گڑا ہوا خزانہ کسی کے ہاتھ لگ جائے تو اُسے اپنے پر نہیں، دوسروں پر لگانے کا رواج رہا ہے۔ پروپکار کا مطلب اکثر تالاب بنانا یا اُن کی مرمت کرنا مانا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بندیل کھنڈ کے مہاراجا چھتر پال کے بیٹے کو گڑے ہوئے خزانے کے بارے میں ایک بیجک ملا تھا، بیجک کی اطلاع کے مطابق جگراج نے خزانہ کھود نکالا، چھتر پال کو پتا چلا تو بہت ناراض ہوئے: ''مرتک دروبیے چندیل کو، کیوں تم لیو اُکھار''۔ اب جب خزانہ اُکھاڑ ہی لیا ہے تو اُس کا سب سے اچھا استعمال کیا جائے گا۔ پتا نے بیٹے کو حکم دیا کہ اُس سے چندیلوں کے بنے سبھی تالابوں کی مرمت کی جائے اور نئے تالاب بنوائے جائیں۔ خزانہ بہت بڑا تھا، پرانے تالابوں کی مرمت ہو گئی اور نئے بھی بننے شروع ہوئے۔ شجرہ نسب کی 22 پیڑھیوں کے نام پر وکرم سمت 286 سے 1162 تک پورے 22 بڑے بڑے تالاب بنے تھے، یہ بندیل کھنڈ میں آج بھی موجود ہیں۔

گڑا ہوا دھن سب کو نہیں ملتا، لیکن سب کو تالاب سے جوڑ کر دیکھنے کے لئے بھی سماج میں کچھ مفروضات رہے ہیں، اماوس اور پورنما، ان دو دنوں کو کارج یعنی اچھے اور وہ بھی عوامی کاموں کے دن مانا گیا ہے۔ ان دونوں دنوں میں نجی کام سے ہٹنے اور عوامی کام سے جڑنے کا دستور رہا ہے، کسان اماوس اور پورنما کو اپنے کھیت میں کام نہیں کرتے تھے، اُس وقت کا استعمال وہ اپنے علاقے کے تالاب وغیرہ کی دیکھ ریکھ اور مرمت میں لگاتے تھے، سماج میں محنت بھی پونجی ہے اور اُس پونجی کو نجی فائدے کے ساتھ عوامی فائدے میں بھی لگاتے جاتے تھے۔ محنت کے ساتھ ساتھ پونجی کا الگ سے انتظام کیا جاتا رہا ہے، اس پونجی کی ضرورت اکثر سردی کے بعد، تالاب میں پانی اُتر جانے پر پڑتی ہے۔

تب گرمی کا موسم سامنے کھڑا ہے اور یہی سب سے اچھا وقت ہے تالاب میں کوئی بڑی ٹوٹ پھوٹ پر دھیان دینے کا۔ سال کی بارہ پورنماؤں میں سے گیارہ پورنماؤں کو محنت کشی/ شرمدان کے لئے رکھا جاتا رہا ہے لیکن پوس کے مہینے کی پورنما پر تالاب کے لیے دھان یا پیسا اکٹھا کئے جانے جانے کی رسم رہی ہے۔ چھتیس گڑھ میں اُس دن چھیر چھیرا تیوہار منایا جاتا ہے، چھیر چھیرا میں لوگوں کے دل نکلتے ہیں، گھر گھر جا کر گیت گاتے ہیں اور گرہست سے دھان اکٹھا کرتے ہیں، دھان کی فصل کٹ کر گھر آ چکی ہوتی ہے، ہر ایک گھر اپنی اپنی حیثیت کے مطابق دھان چندے میں دیتا ہے، اس طرح جمع شدہ دھان گاؤں کے خزانے میں رکھی جاتی۔ اسی فنڈ سے آنے والے دنوں میں تالاب اور دیگر عوامی جگہوں کی مرمت اور نئے کام پورے کیے جاتے۔

عوامی تالابوں میں تو سب کی محنت اور پونجی لگتی ہی تھی، نہایت نجی قسم کے تالابوں میں بھی عوامی شرکت ضروری مانی جاتی رہی ہے۔ تالاب بن جانے کے بعد بھی عوامی جگہوں سے تھوڑی مٹی لا کر

تالاب میں ڈالنے کا چلن آج بھی ملتا ہے، چھتیس گڑھ میں تالاب بنتے ہی اُس میں گھڑسال، ہاتھی خانہ، بازار، مندر، شمشان کی زمین، ویشیالیہ، اکھاڑوں اور اسکولوں کی مٹی ڈالی جاتی تھی۔

شاید آج زیادہ پڑھ لکھ جانے والے اپنے سماج سے کٹ جاتے ہیں، لیکن تب بڑے تعلیمی مراکز سے نکلنے کا موقع تالاب بنوانے کے عمل میں بدل جاتا تھا۔ مدھوبنی، دربھنگہ علاقے میں یہ رواج بہت بعد تک جاری رہا ہے۔ تالابوں میں جان ہے، جان کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا۔ اُسی دن اُن کا نام رکھا جاتا تھا۔ کہیں کہیں تامر پتر سنگین کتبہ پر تالاب کی پوری تفصیل کندہ کی جاتی تھی۔

کہیں کہیں پورے رسم و رواج کے ساتھ تالابوں کی شادی بھی ہوتی تھی۔ چھتیس گڑھ میں یہ رواج آج بھی جاری ہے، شادی سے پہلے تالاب کا استعمال نہیں ہوتا، نہ تو اُس سے پانی نکالتے اور نہ اُسے پار کرتے۔ شادی میں علاقے کے سبھی لوگ، سارا گاؤں پال پر اُمڈ آتا، آس پاس کے مندروں کی مٹی لائی جاتی، گنگا جل لایا جاتا اور اسی کے ساتھ دیگر پانچ یا سات کنوؤں یا تالابوں کا پانی ملا کر شادی پوری ہوتی، کہیں کہیں بنانے والے اپنی حیثیت کے مطابق جہیز تک کا انتظام کرتے تھے۔

جشن شادی کی یاد میں بھی تالاب پر ستون لگایا جاتا، بہت بعد میں جب تالاب کی صفائی کھدائی دوبارہ ہوتی، تب بھی اس واقعہ کی یاد میں ستون لگانے کا رواج رہا ہے۔ آج بڑے شہروں کی تعریف میں آبادی کا حساب مرکز میں ہے، پہلے بڑے شہر یا گاؤں کی تعریف میں اُس کے تالابوں کی گنتی ہوتی تھی، کتنی آبادی کا شہر یا گاؤں ہے، اس کے بدلے پوچھا جاتا تھا کتنے تالابوں کا گاؤں ہے، چھتیس گڑھ میں گاؤں کے لئے کہاوت ہے کہ وہاں 'چھ آگر چھ کوری' یعنی 6 بیسی اور 6 زیادہ، 120 اور 6، 126 تالاب ہونے چاہیے، آج کے بلاسپور ضلع کے ملہار علاقے میں، جو عیسیٰ سے پہلے بسایا گیا تھا، پورے 126 تالاب تھے، اُسی علاقے میں رتن پور (دسویں سے بارہویں صدی)، کھرودی (ساتویں سے بارہویں صدی)، رائے پور کے آرنگ (आरंग)، کبرا (कुबरा) اور سرگوجا ضلع کے دیپاڈیہہ گاؤں میں آج آٹھ سو، ہزار برس بعد بھی کہیں سو اور کہیں پورے 126 تالاب گنے جا سکتے ہیں۔

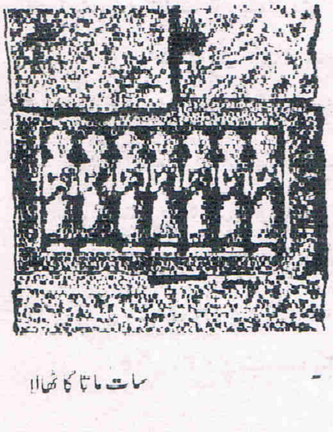

سات ماتا کا تھالا

ان تالابوں کی درازیٔ عمر کا ایک ہی راز تھا، (ममत्व) خود کفالت اور اپنائیت۔ یہ میرا ہے، ہمارا ہے، ایسا ماننے کے بعد رکھ رکھاؤ جیسے لفظ چھوٹے لگیں گے۔ کھجلیا

کے آٹھوں عضو پانی میں ڈوب سکیں، اتنا پانی تال میں رکھنا – ایسا گیت گانے والی، ایسی امید کرنے والی خواتین ہیں تو اُن کے پیچھے ایسا سماج بھی رہا ہے جو اپنے فرض منصبی سے اس خواہش کو پورا کرنے کا ماحول بناتا تھا۔ گھر گیل، گھر میل یعنی سب گھروں کے میل سے تالاب کا کام ہوتا تھا۔

سب کا میل تیرتھ ہے، جو تیرتھ نہ جا سکیں، وہ اپنے یہاں تالاب بنا کر ہی ثواب لے سکتے ہیں۔ تالاب بنانے والا ثواب کمانے والا ہے۔ جو تالاب بچائے، اُس کا بھی اتنا ہی احترام کیا گیا ہے۔ یہاں میلے لگتے ہیں اور ان میلوں میں مصروف ہونے والا سماج تالاب کو اپنی آنکھوں اور دل میں بسا لیتا ہے۔

تالاب سماج کے من میں رہا ہے اور کہیں کہیں تو اُس کے تن میں بھی۔ بہت سے بن باسی سماج، گدنے (गुदने) میں تالاب، باؤڑی بھی گدواتے ہیں۔ گدنوں کے نشان میں جانور، پرند، پھول وغیرہ کے ساتھ ساتھ سہریا (सहरिया) سماج میں سیتا باؤڑی اور سادی باؤڑی کے نشان بھی رائج ہیں۔ سہریا شبری کو اپنا جد امجد مانتے ہیں، سیتا جی سے خاص تعلق ہے۔ اس لیے سہریا اپنی پنڈلیوں پر سیتا باؤڑی بڑی چاہ سے گدواتے ہیں۔

سیتا باؤڑی میں ایک خاص چوکور ہے۔ اندر لہریں ہیں، بیچوں بیچ ایک نقطہ ہے جو زندگی کا اشارہ ہے، چوکور کے باہر سیڑھیاں ہیں اور چاروں کونوں پر پھول ہیں اور پھول میں ہے زندگی کی خوشبو۔ اتنی سب باتیں ایک آسمان۔ عمدہ خاکے میں اتار دینا بہت مشکل ہے۔ لیکن گدنا گودنے والے فنکار اور گدوانے والوں کا من تالاب، باؤڑی میں اتنا رما رہا ہے کہ آٹھ دس لکیریں، آٹھ دس نقطے پورے منظر کو تن پر آسانی سے اتار دیتے۔ یہ رواج تمل ناڈو کے جنوبی آرکاٹ ضلع کے کُرواؤں (कुराउ) سماج میں بھی ہے۔

جس کے من میں، تن میں تالاب رہا ہو، وہ تالاب کو صرف پانی کے ایک گڈھے کی طرح نہیں دیکھ سکے گا۔ اس کے لیے تالاب زندگی ہے، خاندان ہے اور اُس کے کئی تعلق اور رشتہ دار ہیں۔ کس وقت کسے یاد کرنا ہے، تاکہ تالاب بنا رہے اس کی بھی اُسے پوری فکر ہے۔

اگر وقت پر پانی نہیں برسے تو کس کے پاس درخواست گزارنی ہے؟ اندر ہیں برسات کے دیوتا، لیکن سیدھے اُن کو کھٹکھٹانا مشکل ہے۔ شاید ٹھیک بھی نہیں۔ ان کی بیٹی ہیں کاجل، کاجل ماتا تک اپنا مسئلہ پہنچا ئیں تو وہ اپنے پتا کو اس طرف اچھی طرح سے دھیان دلا سکیں گی۔ بوائی ہو جائے اور ایک پکھواڑے تک پانی نہیں برسے تو پھر کاجل ماتا کی پوجا ہوتی ہے، پورا گاؤں کانکڑ بنی (काकड़बनी) یعنی گاؤں کی سیما پر لگے جنگل میں بنے تالاب تک پوجا گیت گاتے ہوئے اکھٹا ہوتا ہے، پھر جنوبی سمت کی جانب منھ کر کے سارا گاؤں کاجل ماتا سے پانی کی درخواست کرتا ہے، جنوب سے ہی پانی آتا ہے۔

کاجل ماتا کو پوجنے سے پہلے کئی مقامات پر ہوا کی جانچ بھی کی جاتی ہے۔ یہ اساڑھ شکل (शुक्ल)

پورنما پر ہوتی ہے۔ اس دن تالابوں پر میلا بھرتا ہے اور ہوا کی رفتار دیکھ کر پانی کی پیش گوئی کی جاتی ہے، اُس حساب سے پانی وقت پر گر جاتا ہے، نہ گرے تو پھر کا جل ماتا کو بتانا پڑتا ہے۔

تالاب کا لبالب بھر جانا بھی ایک بڑا جشن بن جاتا ہے، سماج کے لئے اس سے بڑا اور کون سا موقع ہوگا کہ تالاب کی اپرا چل نکلتی ہے۔ بھج (کچھ) کے سب سے بڑے تالاب ہمیر سر کے گھاٹ میں بنی ہوئی ہاتھی کی ایک مورتی اپرا چلنے کی اطلاع دینے والی ہے۔ جب پانی اس مورتی کو چھو لیتا ہے تو پورے شہر میں خبر پھیل جاتی تھی، شہر تالاب کے گھاٹوں پر آجاتا، کم پانی کا علاقہ اس موقع کو ایک تیوہار میں بدل لیتا، بھج کے راجا گھاٹ پر آتے اور پورے شہر کی موجودگی میں تالاب کی پوجا کرتے اور پورے بھرے ہوئے تالاب کی دعا لے کر لوٹتے۔ تالاب کا پورا بھر جانا، صرف ایک واقعہ نہیں، لطف ہے، خوشی کا پیش خیمہ ہے، جشن ہے، بڑا جشن ہے۔ وہ پرجا اور راجا کو گھاٹ تک لے آتا تھا۔

ان ہی دنوں دیوتا بھی گھاٹ پر آتے ہیں، جب جھولن تیوہار میں مندر کی منقولہ مورتیاں تالاب تک لائی جاتی ہیں اور وہاں پورے سنگھار کے ساتھ انہیں جھولا جھلایا جاتا ہے۔ بھگوان بھی ساون کے جھولوں کی پینگ کا لطف تالاب کے گھاٹ پر اُٹھاتے ہیں۔

کوئی بھی تالاب اکیلا نہیں ہے، وہ بھرے پُرے پانی خاندان کا ایک ممبر ہے، اُس میں سب کا پانی ہے اور اُس کا پانی سب میں ہے، ایسا عقیدہ رکھنے والوں نے ایک تالاب سچ مچ ایسا ہی بنا دیا تھا۔ جگناتھ پوری کے مندر کے پاس بندو ساگر میں دیش بھر کے ہر ایک آبی وسیلہ کا، ندیوں اور سمندروں تک کا پانی ملا ہے، دور دور سے، الگ الگ سمتوں سے پوری آنے والے عقیدت مند اپنے ساتھ اپنے علاقے کا تھوڑا سا پانی لے آتے ہیں اور اُسے بندو ساگر میں پیش کر دیتے ہیں۔ دیش کی یکجہتی کے امتحان کی اس گھڑی میں بندو ساگر، 'راشٹریہ ایکتا کا ساگر' کہلاتا ہے۔ بندو ساگر متحد ہندوستان کی نشانی ہے۔

آنے والا وقت کیسا ہوگا؟ یہ بتانا ہمیشہ بڑا مشکل رہا ہے، لیکن اس کا ایک معیار تالاب بھی تھا۔ نوراتر کے بعد مورتیاں غرقاب کی جاتی ہیں۔ راجستھان میں اس موقع پر لوگ تالابوں پر اکھٹا ہوتے اور تب بھوپا یعنی پجاری جی وسرجن کے بعد تالاب میں پانی کی سطح دیکھ کر آنے والے وقت کی پیش گوئی کرتے تھے۔ برسات تب تک بیت چکی ہوتی ہے، جتنا پانی تالاب میں جمع ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے، اب اِس حالت پر منحصر ہیں، آنے والے وقت کے حالات۔

آج نقارے کا رواج مٹ سا گیا، تالاب میں آبی سطح دیکھ کر آئندہ کی پیش گوئی کرنا ہی تو کئی تالابوں پر کھڑے نقارے شاید یہی کہتے کہ بُرا وقت آنے والا ہے۔ ☆☆☆☆

آج بھی کھرے ہیں تالاب

بھوپا ہوتے تو ضرور بتاتے کہ تالابوں کے لئے بُرا وقت آگیا تھا، جو بُرا وقت آگیا تھا!! بہترین روایات اور اقدار تالاب بناتی تھیں، وہ ہی سوکھنے لگی تھیں۔

دوری ایک چھوٹا سا لفظ ہے، لیکن راج اور سماج کے درمیان اس لفظ کے آجانے سے سماج کی مشکل کتنی بڑھ جاتی ہے، اِس کا کوئی حساب نہیں، پھر جب یہ دوری ایک تالاب کی نہیں، سات سمندروں کی ہو جائے تو بیان کے لیے کیا رہ جاتا ہے؟

انگریز سات سمندر پار سے آئے تھے اور اپنے سماج کے تجربے لے کر آئے تھے، وہاں طبقات پر قائم معاشرہ تھا، جس میں مالک اور غلام کے رشتے تھے، وہاں سرکار ہی فیصلہ کرتی تھی کہ سماج کا فائدہ کس بات میں ہے، یہاں جاتی کا سماج تھا اور راجا ضروری تھے لیکن راجا اور پرجا کے تعلقات انگریزوں کے اپنے تجربوں سے بالکل مختلف تھے، یہاں سماج اپنا مفاد خود طے کرتا تھا اور اُسے اپنی طاقت سے، اپنے تعاون سے اُس کے لئے کام کرتا تھا، راج اُس میں مددگار ہوتا تھا۔

پانی کا انتظام اُس کی فکر ہمارے سماج کے فرائض منصبی کے عظیم سمندر کی ایک بوند تھی، سمندر اور بوند ایک دوسرے سے جڑے تھے۔ بوندیں الگ ہو جائیں، تو نہ سمندر رہے، نہ بوند بچے، سات سمندر پار سے آنے والے انگریزوں کو سماج کے فرائض، مقاصد و مفاہمت کا نہ تو عظیم سمندر نظر آیا، نہ اُس کی بوندیں دکھائی دیں، انہوں نے اپنے یہاں کے تجربہ اور تربیت کی بنیاد پر یہاں حکومت میں دستاویز ضرور تلاش کرنے کی کوشش کی، لیکن ویسے ریکارڈ راج میں رکھے نہیں جاتے تھے، اس لئے انہوں نے مان لیا کہ یہاں سارا انتظام انہیں کو کرنا ہے، یہاں تو کچھ ہے ہی نہیں!

ملک کے کئی علاقوں میں گھوم پھر کر انگریزوں نے کچھ یا کافی معلومات ضرور جمع کیں، لیکن یہ ساری محنت تجسس سے زیادہ نہیں تھی۔ اُس میں مقاصد و فرائض کے سمندر اور اُس کی بوندوں کو سمجھنے کی بینائی نہیں تھی، اس لئے عشر عشیر معلومات حاصل کرنے کے بعد بھی جو حکمت علمی بنی اُس نے تو اس سمندر اور بوند کو الگ الگ ہی کر دیا۔

شاندار دور اگرچہ گزر گیا تھا، لیکن انگریزوں کے بعد بھی تباہی کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی کی ابتداء تک انگریز یہاں گھومتے پھرتے جو کچھ دیکھ رہے تھے، لکھ رہے

تھے، جو گزیٹیئر بنا رہے تھے، اُن میں کئی جگہوں پر چھوٹے ہی نہیں، بڑے بڑے تالابوں پر چل رہے کام کی تفصیل ملتی ہے۔ مدھیہ پردیش کے درگ اور راجنند گاؤں جیسے علاقوں میں ۱۹۰۷ء تک بھی ''بہت سے بڑے تالاب بن رہے تھے۔'' ان میں تاندولا نامی تالاب ''گیارہ برس تک لگاتار کام چلنے کے بعد بن کر بس ابھی تیار ہی ہوا تھا، اس سے سینچائی کے لئے نکلی نہروں- نالیوں کی لمبائی 513 میل تھی۔''

جو کردار سماج کو ٹکائے رکھنے کے لئے یہ سب کام کرتے تھے، ان میں سے کچھ کے ذہن میں سماج کو ڈگمگانے والا نیا انتظام بھلا کیسے جگہ کرتا؟ اُن کی طرف سے انگریزوں کو چیلنج بھی دیا گیا۔ سانسی، بھیل جیسی خوددار ذاتوں کو اسی ٹکراؤ کی وجہ سے انگریز حکومت نے ٹھگ اور جرائم پیشہ تک قرار دیا۔ اب جب سب کچھ انگریزوں کو ہی کرنا تھا تو ان سے پہلے کے پورے ڈھانچے کو ٹوٹنا ہی تھا، اُس ڈھانچے کو دھتکارنا، اس کی اَن دیکھی کرنا کوئی بہت سوچی سمجھی بے رحمانہ سازش نہیں تھی، وہ تو اس نئے نظریہ کا لازمی نتیجہ تھا اور بدقسمتی سے یہ نیا نظریہ ہمارے سماج کے اُن لوگوں تک کو بھا گیا تھا جو دل سے انگریزوں کی مخالفت کر رہے تھے اور ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

پچھلے دور کے تجربہ کار ہاتھ اب نااہل کاریگروں میں بدل گئے تھے، ایسے بہت سے لوگ جو ماہر لوگوں کی فہرست میں تھے، وہ اب اَن پڑھ، غیر مہذب، غیر تربیت یافتہ شمار کئے جانے لگے تھے۔ اُس نئے راج اور اسکی روشنی میں نئے سماجی ادارے، نئے مظاہرے بھی اپنے ہی مقامی افسروں کی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں انگریزوں سے بھی آگے بڑھ گئے تھے، آزادی بعد کی سرکاروں، سماجی اداروں اور زیادہ تر آندولنوں میں بھی یہی شرمناک روایت جاری رہی، اُس باصلاحیت سماج کے ہاتھ سے پانی کا انتظام کس طرح چھینا گیا اس کی ایک جھلک تب کے میسور راج میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

۱۸۰۰ء میں میسور ریاست کے منتظم دیوان پُرنیا تھے، تب ریاست میں 39,000 تالاب تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کسی پہاڑی کی چوٹی پر ایک بوند گرے، آدھی اِس طرف اور آدھی اُس طرف بہے تو دونوں طرف اسے سمیٹ کر رکھنے والے تالاب موجود تھے، سماج کے علاوہ حکومت بھی ان عمدہ تالابوں کی دیکھ ریکھ کے لئے ہر سال کچھ لاکھ روپے لگاتی تھی۔

راج بدلا، انگریز آئے، سب سے پہلے انہوں نے اس 'فضول خرچی' کو روکا اور ۱۸۳۱ء میں ریاست کی جانب سے تالابوں کے لئے دی جانے والی رقم کو کاٹ کر ایک دم نصف کر دیا گیا۔ اگلے 32 برسوں تک نئی حکومت کی کنجوسی کو سماج اپنی رواداری سے نبھاتا رہا، تالاب لوگوں کے تھے، اس لئے حکومت سے ملنے والی مدد کے کم ہو جانے اور کہیں کہیں بند ہو جانے کے بعد بھی سماج تالابوں کو سنبھالتا رہا۔ برسوں

پرانی یادگار ایسے ہی نہیں مٹ جاتی، لیکن پھر 32 برس بعد یعنی ۱۸۶۳ء میں وہاں پہلی بار پی. ڈبلیو ڈی. کا محکمہ قائم ہوا اور سارے تالاب لوگوں سے چھین کر اُسے سونپ دیئے گئے۔ ساکھ پہلے ہی چھین لی گئی تھی، پھر وسائل چھین لئے گئے اور اب ملکیت بھی۔ وقار، وسائل اور حقوق کے بغیر سماج لاچار ہونے لگا تھا، ایسی صورت حال میں سماج سے صرف اپنی ذمہ داری نبھانے کی امید کیسے کی جاتی؟

میسور کے 39,000 تالابوں کی خستہ حالی کا قصہ بہت طویل ہے، پی. ڈبلیو. ڈی. سے کام نہیں چلا تو پھر پہلی بار سینچائی محکمہ قائم ہوا، اسے تالاب سونپے گئے، وہ بھی کچھ نہیں کر پایا تو واپس پی. ڈبلیو. ڈی. کو۔ انگریز محکموں کی ادلا بدلی کے درمیان تالابوں سے ملنے والا محصول بڑھاتے گئے اور رکھ رکھاؤ کی رقم کم کرتے گئے۔ انگریز اس کام کے لئے چندہ تک مانگنے لگے جو پھر جبراً وصولی تک پہنچ گیا۔

اِدھر دلّی تالابوں کی خستہ حالی کی نئی راجدھانی بن چلی تھی۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے تک یہاں 350 تالاب تھے، انہیں بھی محصول کے نفع - نقصان کی ترازو میں تولا گیا اور آمدنی نہ ہونے والے تالاب حکومت کے پلڑے سے باہر پھینک دیئے گئے۔

اسی دور میں دہلی میں نل لگنے لگے تھے، اس کی مخالفت کی ایک ہلکی سی سریلی آواز ۱۹۰۰ء کے آس پاس شادیوں کے موقع پر گائی جانے والی 'گاریوں'، شادی کے گیتوں میں سنائی دیتی تھی۔ بارات جب پنگت میں بیٹھتی تو عورتیں "فرنگی نل مت لگوائے دیو" گیت گاتیں لیکن نل لگتے گئے اور جگہ جگہ بنے ہوئے تالاب، کنویں اور باؤڑیوں کے بدلے انگریز کے زیر انتظام 'واٹر ورکس' سے پانی آنے لگا۔

پہلے تبھی بڑے شہروں میں اور پھر دھیرے دھیرے چھوٹے شہروں میں بھی یہی خواب سچا کیا جانے لگا۔ لیکن صرف پائپ لائن بچھانے اور نل کی ٹونٹی لگا دینے سے پانی نہیں آتا۔ یہ بات اُس وقت نہیں لیکن آزادی کے کچھ عرصہ بعد دھیرے دھیرے سمجھ میں آنے لگی تھی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد تو یہ ڈراؤنے خواب میں بدلنے لگی تھی۔ تب تک کئی شہروں کے تالاب بے توجہی کی کیچڑ سے پٹ چکے تھے اور اُن پر نئے محلے، بازار، اسٹیڈیم کھڑے ہو چکے تھے، لیکن پانی اپنا راستہ نہیں بھولا۔ تالاب ہتھیا کر بنائے گئے نئے محلوں میں برسات کے دنوں میں پانی بھر جاتا ہے اور پھر برسات بیتی نہیں کہ ان شہروں میں پانی کی پریشانی کے بادل چھانے لگتے ہیں۔

جن شہروں کے پاس فی الحال تھوڑا پیسہ، تھوڑی طاقت ہے وہ کسی اور کے پانی کو چھین کر اپنے نلوں کو کسی طرح چلا رہے ہیں لیکن باقی کی حالت تو ہر سال بگڑتی ہی جاتی ہے، کئی شہروں کے کلکٹر فروری میں آس پاس کے گاؤں کے بڑے تالابوں کا پانی سینچائی کے کام سے روک کر شہروں کے لئے محفوظ کر لیتے ہیں۔

شہروں کو پانی چاہیے لیکن پانی دے سکنے والے تالاب نہیں، تب پانی ٹیوب ویل سے ہی مل سکتا ہے لیکن اس کے لئے بجلی، ڈیزل کے ساتھ ساتھ اُسی شہر کے نیچے پانی چاہیے، مدراس (چینئی) جیسے کئی شہروں کا تکلیف دہ تجربہ یہی بتاتا ہے کہ لگاتار گرتی آبی سطح صرف پیسے اور حکومت کے بل پر تھامی نہیں جاسکتی، کچھ شہروں نے دور بہنے والی کسی ندی سے پانی اُٹھا کر لانے کے بے حد خرچیلے اور غیر رسمی طریقے اپنائے ہیں۔ لیکن ایسی نگر پالیکاؤں پر کروڑوں روپئے کے بجلی کے بل بھی چڑھ چکے ہیں۔

اندور کی ایسی ہی مثال آنکھیں کھول سکتی ہے، یہاں دور بہنے والی نرمدا کا پانی لایا گیا تھا۔ منصوبہ کا پہلا دور چھوٹا پڑا، تو ایک آواز سے دوسرے دور کی مانگ بھی اُٹھی اور اب ۱۹۹۳ء میں تیسرے دور کے لئے بھی مظاہرے ہو رہے ہیں، اس میں کانگریس، بھارتیہ جنتا پارٹی، سماجوادی دلوں کے علاوہ شہر کے پہلوان شری انوکھی لال بھی ایک پیر پر ایک ہی جگہ 34 دن تک کھڑے رہ کر 'ستیہ گرہ' کر چکے ہیں، اس اندور میں ابھی کچھ ہی پہلے تک بلاولی جیسا تالاب تھا، جس میں فلائنگ کلب کے جہاز کے گر جانے پر بحری فوج کے غوطہ خور اُترے تھے لیکن وہ ڈوبے ہوئے جہاز کو آسانی سے تلاش نہیں کر پائے تھے۔ آج بلاولی ایک بڑا سوکھا میدان ہے اور اس میں فلائنگ کلب کے جہاز اُڑائے جاسکتے ہیں۔

اندور کے پڑوسی شہر کا قصہ تو اور بھی عجیب ہے، پچھلے 30 برس میں یہاں کے سبھی چھوٹے بڑے تالاب پور دیے گئے اور اُن پر مکان اور کارخانے بنا دیے گئے، لیکن پھر 'پتہ' چلا کہ انہیں پانی دینے کا کوئی ذریعہ نہیں بچا ہے۔ شہر کے خالی ہونے تک کی خبریں چھپنے لگی تھیں، شہر کے لئے پانی مہیا کرنا تھا لیکن پانی کہاں سے لائیں؟ دیواس کے تالابوں، کنوؤں کے بدلے ریلوے اسٹیشن پر دس دن تک دن رات کام چلتا رہا۔

۲۵ / اپریل ۱۹۹۰ء کو اندور سے 50 ٹینکر پانی لے کر ریل گاڑی دیواس آئی، بلدیاتی حکومت کے وزیر کی موجودگی میں ڈھول نگاڑے بجا کر پانی کی ریل کا خیر مقدم کیا گیا۔ وزیر نے ریلوے اسٹیشن آنے والی 'نرمدا' کا پانی پی کر اس منصوبہ کا افتتاح کیا۔ پریشانی کے وقت اس سے پہلے بھی گجرات اور تامل ناڈو کے کچھ شہروں میں ریل سے پانی پہنچایا گیا ہے لیکن دیواس میں تو اب ہر صبح پانی کی ریل آتی ہے، ٹینکروں کا پانی پمپوں کے سہارے ٹینکوں میں چڑھتا ہے اور تب شہر میں تقسیم ہوتا ہے۔

ریل کا کرایہ ہر روز چالیس ہزار روپیہ ہے، بجلی سے پانی اوپر چڑھانے کا خرچ الگ اور اندور سے ملنے والے پانی کی قیمت بھی لگالی جائے تو پورا منصوبہ دودھ کے بھاؤ پڑے گا، لیکن ابھی حکومت مدھیہ پردیش مرکز سے ریل کرایہ معاف کرواتی آرہی ہے، دہلی کے لئے دور گنگا کا پانی اُٹھا کر لانے والی مرکزی حکومت

ابھی مدھیہ پردیش کے ساتھ فراخ دلی برت رہی ہے، شری منموہن سنگھ کی نئی 'فراخ دلانہ' حکمت عملی ریل اور بجلی کے دام چکانے کو کہہ بیٹھے تو دیو اس کو جہنم زار بننے میں کتنی دیر لگے گی؟

پانی کے معاملے میں بیوقوفی کی مثالوں کی کوئی کمی نہیں ہے، مدھیہ پردیش کے ہی ساگر شہر کو دیکھیں، کوئی 600 برس پہلے لاکھا بنجارے کے ذریعہ بنائے گئے ساگر نامی ایک عظیم تالاب کے کنارے بسے ہوئے اس شہر کا نام ساگر ہی ہو گیا تھا۔ آج یہاں نئے معاشرے کے پانچ بڑے باوقار ادارے ہیں۔ ضلع اور ڈویژن کے صدر مقامات ہیں، پولیس تربیتی مرکز ہے، فوج کے مہار رجمنٹ کا صدر مقام ہے، نگر پالیکا ہے اور سرہری سنگھ کے نام پر بنی ہوئی یونیورسٹی ہے۔ ایک بنجارہ یہاں آیا اور عظیم ساگر بنا کر چلا گیا لیکن نئے سماج کے یہ وسائل سے مالامال ادارے اس ساگر کی دیکھ بھال تک نہیں کر پائے۔ آج ساگر تالاب پر گیارہ ریسرچ مقالات لکھے جا چکے ہیں، ڈگریاں تقسیم چکی ہیں، لیکن ایک ان پڑھ مانے گئے بنجارے کے ہاتھوں ساگر کو پڑھا لکھا مانا گیا سماج بچا تک نہیں پا رہا ہے۔

اُن دیکھی کی اس آندھی میں کئی تالاب پھر بھی کھڑے ہیں، دیش بھر میں کوئی آٹھ سے دس لاکھ تالاب آج بھی بھر رہے ہیں اور ورن دیوتا کا پرساد اچھے (सुपात्रों) کرداروں کے ساتھ ساتھ (कुपात्रों) بدکرداروں میں بھی بنٹ رہا ہے۔ اُن کی مضبوط تقسیم اس کا ایک سبب ہے لیکن ایک یہی سبب نہیں۔ تب تو مضبوط پتھر کے بنے ہوئے پرانے قلعے کھنڈروں میں نہیں بدلتے، کئی طرف سے ٹوٹ چکے سماج میں تالابوں کی یاد ابھی بھی باقی ہے، یاد کی یہ مضبوطی پتھر کی مضبوطی سے زیادہ مضبوط ہے۔

چھتیس گڑھ کے گاؤں میں آج بھی چھیر چھیرا کے گیت گائے جاتے ہیں اور اُس سے ملے اناج سے اپنے تالابوں کی مرمت کی جاتی ہے۔ آج بھی بندیل کھنڈ میں کجلیوں کے گیت میں اُس کے آٹھوں اجزا ڈوب سکیں - ایسی ...... کامنا/ امید کی جاتی ہے، ہریانہ کے نارنول میں جات اُتارنے کے بعد ماتا پتا تالاب کی مٹی کاٹتے ہیں اور پال پر چڑھاتے ہیں، نہ جانے کتنے شہر، کتنے سارے گاؤں تالابوں کی وجہ سے ٹکے ہوئے ہیں، بہت سی نگر پالیکائیں آج بھی انہیں تالابوں کی وجہ سے پل رہی ہیں اور سینچائی محکمہ انہیں کے دم پر کھیتوں کو پانی دے پا رہا ہے۔ الور ضلع کے بیجا کی ڈاہ جیسے بہت سے گاؤں میں آج بھی ساگروں کے وہی نایک نئے تالاب بھی کھود رہے ہیں اور پہلی برسات میں ان پر رات رات بھر پہرا دے رہے ہیں۔ ادھر روز صبح شام گھڑسی سر میں آج بھی سورج من بھر سونا انڈیلتا ہے۔

کچھ کانوں میں آج بھی یہ آواز گونجتی ہے:

''اچھے اچھے کام کرتے جانا''

حصہ دوم

گوچر کا کا پرساد بانٹتا

لاپوڑیا

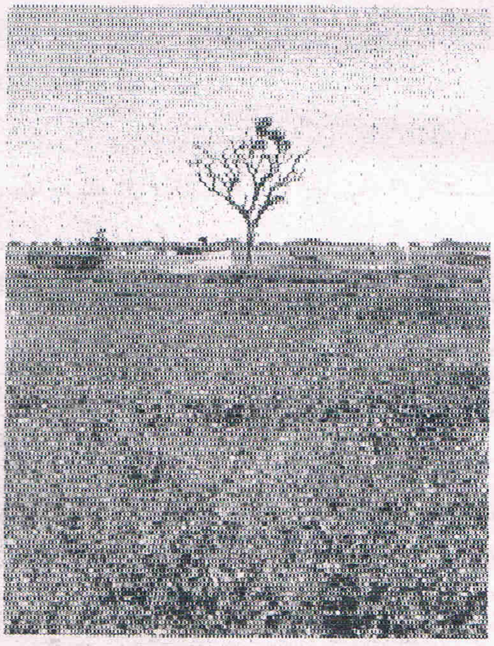

گرام وکاس نو یووک منڈل

لاپوڑیا

گوچر کا پرساد بانٹتا لاپوڑیا

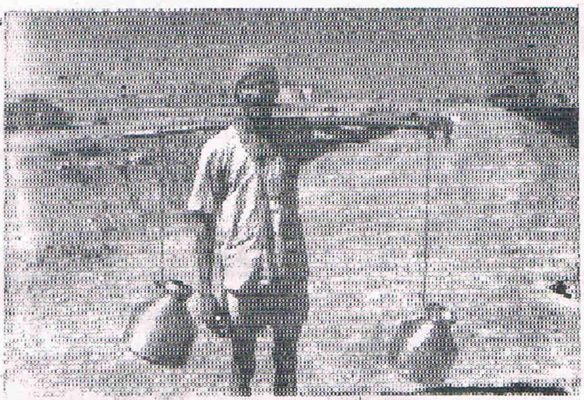

سن ۲۰۰۴ء : جیپور ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں لاپوڑیا کے لیے اس تاریخ، اس سن کا مطلب ہے ۴ اور ۲ یعنی ۶ سال کا اکال۔ آس پاس کے بہت سارے گاؤں اس لمبے اکال میں ٹوٹ چکے ہیں، لیکن لاپوڑیا آج بھی اپنا سر، ماتھا اٹھائے مضبوطی سے کھڑا ہوا ہے۔ لاپوڑیا کا ماتھا گھمنڈ کے بدلے نرم دکھتا ہے۔ اس نے چھ سال کے اکال سے لڑنے کے بدلے اس کے ساتھ جینے کا طریقہ کھوجنے کی خواہش کی ہے۔ اس لمبے سفر نے لاپوڑیا گاؤں کو لاپوڑیا کی زمین میں چھپی جڑوں تک پہنچایا ہے۔ ان جڑوں نے اوپر کے اکال کو بھول کر زمین کے اندر چھپے پانی کو پہچاننے کا محنتی کام کیا ہے اور اس محنت نے آج ۶ سال کے اکال کے بعد بھی لاپوڑیا کو اپنے پسینہ سے سینچ کر ہرا ابھرا بنایا ہے۔

کوئی بھی سماج سفر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسے اپنے لوگوں، اپنے جانوروں، اپنی زمین، اپنے پیڑ پودوں، اپنے کنویں، اپنے تالابوں، اپنے کھیتوں کے لیے کوئی نہ کوئی ایسے انتظامات کرنے پڑتے ہیں، جو وقت اور خود کو ثابت کر سکیں۔ وقت کے کسی بھی خاص حد میں سبھی فردوں کے ساتھ مل جل کر جو انتظامات ہوتے ہیں اسے پھر سبھی فرد مل جل کر پال پوس کر بڑا کرتے ہیں اور مضبوط بناتے ہیں۔ اپنے اوپر خود لگایا ہوا یہ قاعدہ ایک پیڑھی سے دوسری پیڑھی کو سونپا جاتا ہے۔ ایک پیڑھی اپنی عمر پوری کرے، اس سے پہلے ویسی ہی ماہر نسل پھر سامنے آجاتی ہے۔ اس امانت کی رکھوالی کرنے، تب سماج کی زندگی بنائے رکھنے، لگاتار چلتی رہتی ہے۔

پچھلے دو سو سالوں کی اتھل پتھل نے سماج کو چلانے والے ان اصولوں کو، قاعدہ کو کافی حد تک توڑا تھا۔ سماج کو جو چیزیں ٹکاتی تھیں، چلاتی تھیں، ان کے وقار کو اس دور نے ختم کیا۔ پرانے انتظامات ٹوٹے، لیکن ان کے بدلے کوئی نئے کارگر انتظامات ان کی جگہ نہیں لے پائے۔ لاپوڑیا کوئی انوکھا گاؤں نہیں تھا۔ اسی لیے وہ بھی اس اتھل پتھل کے دور میں، اس آندھی کے سامنے اپنے پیر جما کر کھڑا نہیں رہ سکا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے گاؤں کی طرح وہ بھی ذریعہ کی کمی، لاچاری کے آگے ماتھا جھکا چکا تھا۔

اپنی جڑوں کو پہچاننا :

لیکن آج لاپوڑیا کا ماتھا پھر اونچا ہوا ہے۔ اپنی جڑوں کو پہچاننے، ان کو تلاشنے کا یہ سفر بہت لمبا رہا ہے۔ لیکن کائنات میں کوئی بھی کام بنا صبر کے پھل نہیں دیتا ہے۔ بہت پہلے لاپوڑیا گاؤں ٹوٹ چکا تھا، اس کے

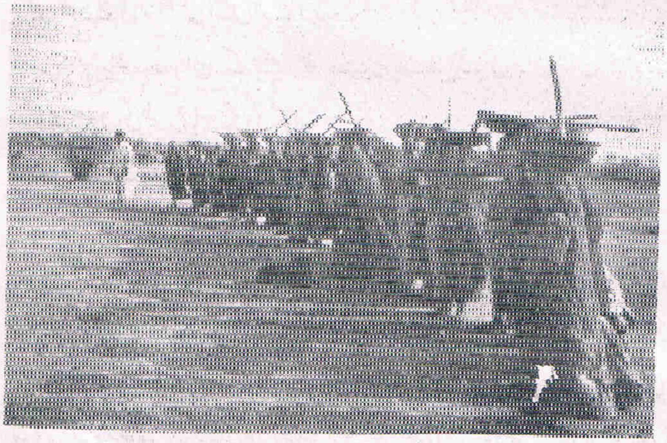

کھیت اجڑ گئے تھے، اس کا گوچر سوکھ گیا تھا۔ گوچر پر یہاں وہاں قبضے ہو چلے تھے اور اس کے دو پرانے تالاب بھی پال ٹوٹنے کی وجہ سے ختم ہو چکے تھے۔ لاپوڑیا کے لوگوں نے اس برے دور میں گاؤں سے ۸۰ کلومیٹر دور جیپور جیسے شہر میں دھیرے دھیرے پہنچ کر اپنے کو بچانے کی خزانہش کی تھی۔ کبھی جو خاندان اس پورے گاؤں کے انتظامات سنبھالتا تھا، اس برے وقت میں اس کے سب سے اچھے فرد بھی لاپوڑیا چھوڑ کر کہیں اور نوکری کرنے چلے گئے تھے۔ انہیں میں ایک تھے شری لچھمن سنگھ۔ گاؤں کے ٹھکانے دار، ٹھاکر خاندان میں پیدا ہوئے لچھمن سنگھ تب بھی عزت کے ساتھ 'بنا جی' کہلاتے تھے۔ اجڑے گاؤں کے 'بنا جی' بھی اکھڑ کر یہاں سے دور چلے گئے تھے۔

لیکن لاپوڑیا گاؤں کو 'بنا جی' سے کوئی بڑا کام لینا تھا۔ اسی لیے بنا جی ۱۹۸۸ء میں اسی صوبے کے الور ضلع میں کام شروع کر رہی تنظیم ترون بھارت سنگھ میں جا پہنچے۔ یہاں آنے سے پہلے وہ تھوڑی مدت کے لیے بھارت سرکار کے کھیل اور یُوا منترالیہ کے ذریعہ چلائے جا رہے نہرو یوا کیندرہ کے کاموں سے بھی جڑے رہے تھے۔ اس ذریعہ سے اپنے گاؤں میں شاید بغیر زیادہ کچھ سوچے انہوں نے گاؤں کے جوانوں کو ایک جٹ کر ''گرام وکاس نو یوک منڈل'' کی بنیاد رکھی تھی۔ ایسے نو یوک منڈلوں کی کوئی کمی نہیں تھی اور ان سے ہونے والا کام بھی کچھ نیا نہیں کر پایا تھا۔ پھر بھی ۱۹۸۷ء سے پہلے کے دور میں لچھمن جی نے نوجوانوں کو ایک جٹ کر شرمدان کے ذریعہ لاپوڑیا کے علاوہ آس پاس کے دس گاؤں میں کچھ کام کیے تھے اور کبھی اسکول نہ جا سکنے والے

بچوں کے لیے ایک اسکول بھی چلایا تھا۔

ترن بھارت سنگھ میں پچھمن سنگھ نے راجیند رسنگھ جی کے ساتھ کام کرتے ہوئے اکال میں اجڑے گاؤں میں پانی کا چھور پکڑ کر زندگی کی خوشی لانے کا راز جاننا شروع کیا۔ لیکن پھر ان کو لگا کہ اس راز کی باقی پرتیں کھولنے کی خزانہش انہیں اپنے اجڑے گاؤں میں ہی لوٹ کر کرنا چاہیے۔ لاپوڑیا کے بنا جی یعنی پچھمن سنگھ واپس لاپوڑیا لوٹے۔ ان کے پیچھے دھیرے دھیرے لاپوڑیا کی پرانی شان بھی لوٹنے لگی۔ وہ شان جو یہاں کی کچھ پیڑھیوں کی طرح باہر چلی گئی تھی۔

دھرتی کی پوجا:

گاؤں چھوڑنے سے پہلے پچھمن سنگھ جی نے گاؤں کے نوجوانوں کے لیے کھیل کود کے ذریعہ سے جو عام تنظیم بنائی تھی اسی تنظیم کو پھر سے بیس بنا کر انہوں نے گرام سیوا اور گرام وکاس کے پچھلے چھوٹے ہوئے کاموں کو اٹھانا شروع کیا۔ ۱۹۸۴ء میں بھی ایسے کچھ کام شروع کر کے ہی وہ گاؤں کے باہر گئے تھے۔ ان کاموں کو کرنے کے لیے کوئی پیسہ یا بجٹ نہیں تھا۔ سبھی کے ذریعہ کام کرنے کی کوئی خاص سمجھ بھی تب نہیں رہی ہوگی۔ جو کام لوگوں نے تب کرنے بند کر دیئے تھے، انہیں کو دھیرے دھیرے پھر سے شروع کرنے کا ماحول بنانا تھا۔ اس میں گاؤں کے جانوروں کی خدمت کے لیے پینے کے پانی کا انتظام کرنا، کھیتی کرنا بھی شامل تھا۔ کبھی وہ گاؤں کے دھیان نہ دیئے جانے والے چوک سے صفائی شروع کرتے، تو کبھی پورے دن گاؤں کو اس کونے سے اُس کونے تک پڑا ہوا گوبر اٹھاتے اور پھر اسے رات کو کھیتوں میں ڈالتے، کچرے کو کھاد میں بدلتے تھے۔ اس کام میں ان کے دوست شری رام اوتار کُماوت بھی ساتھ تھے۔ یہ دونوں نوجوان روز گاؤں کے پھوٹ چکے بڑے تالاب کو دیکھتے، لیکن اسے ٹھیک کیسے کرنا ہے، یہ ان کی سمجھ اور قوت سے باہر کی بات لگتی۔ لیکن پھر ۱۹۸۲ء میں ایک دن اچانک ان دونوں نے اپنے کدال پھاوڑے اٹھائے اور لگ

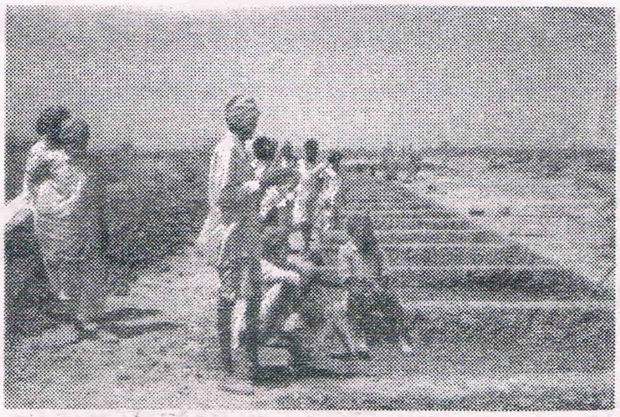

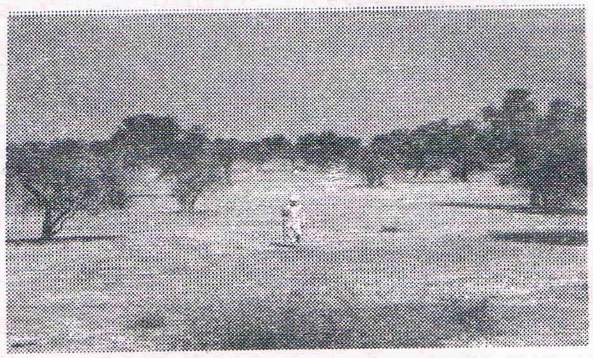

گئے بڑے تالاب کو ٹھیک کرنے۔ کتنے برس لگتے اسے ٹھیک کرنے میں، یہ انہیں نہیں معلوم تھا۔لوگوں نے انہیں روکا اور سمجھانے کی خزانہش کی کہ اس طریقہ سے کچھ ہونے نہیں والا۔لیکن تبھی گاؤں کے عزت دار پجاری سوامی سیارام جی بھی دھرتی کی اس پوجا میں شامل ہوئے۔ پھر شری شیوکرن بیروا بھی ساتھ ہو گئے۔ چاروں لوگ مل کر دن بھر مٹی کھودتے اور ایک دو پیڑھی سے ٹوٹے تالاب کی پال پر ایک ایک ٹوکری مٹی ڈال کر دھیرے دھیرے پال اوپر اٹھانے لگے۔ پھر کچھ دن بعد ان کی محنت اور صبر دیکھ کر لاپوڑیا کے ۱۵۔۲۰ اور لوگ بھی ساتھ ہو گئے۔ ایک سے دو اور اب دو سے بیس لوگوں کے ہاتھ لگے تو پہلی بار ان سب نے اپنا دماغ بھی لگایا۔ ایک بیٹھک ہوئی اور اس میں طے کیا گیا کہ یہ گاؤں کا کام ہے، تو پورے گاؤں کو بلانا چاہیے۔

گاؤں کے گھروں کی ذمہ داری بانٹی گئی۔ سب مل کر سب کا کام کریں۔ ایسی کڑی جو ٹوٹ گئی تھی، اب پھر سے جڑ گئی تھی۔ گرمی کے دو مہینوں میں سب نے مل کر بڑے تالاب کی ٹوٹی پال کو سدھارا۔ لیکن کائنات شاید ابھی لاپوڑیا کا امتحان لینا چاہتی تھی۔

پہلی ہی برسات میں تالاب پھر ٹوٹ گیا۔ لیکن لاپوڑیا میں سالوں بعد ابھر رہی تنظیم نے صبر نہیں کھویا۔ لاؤڈ اسپیکر سے آواز دیکر پورے گاؤں کو اکٹھا کیا اور مٹی سے بھری بوریاں ڈالکر ٹوٹی ہوئی پال کو کسی طرح سنبھال لیا۔ آنے والے سالوں میں ترون بھارت سنگھ نے اس بڑے تالاب کو ٹھیک کرنے میں مدد دی۔ اور تب دس سال کی محنت کے بعد لاپوڑیا کو بڑے تالاب کا پھر سے وردان ملا۔ تالاب میں اتنا پانی روکا کہ اس کے نیچے کے کھیتوں میں دھیرے دھیرے، بہت سے خاندانوں کو سدھرتی کھیتی سے کچھ کہنے لائق فائدہ بھی ملنے لگا۔ اس وقت گاؤں کے ۱۰۰ بیگھا، ۱۰۰ بیگوڑی میں سنچائی مہیا ہونے لگی تھی۔

چھوٹے ہوئے چھور پکڑنا:

اسی بیچ لچھمن جی نے شانتی پرتشٹھان سے شائع ''آج بھی کھرے ہیں تالاب'' کتاب

پڑھی۔ اسے انہوں نے اپنے دیگر ساتھیوں کو بھی پڑھایا۔ سبھی کو لگا کہ اس میں جن تہذیب کا ذکر ہے وہ ان کی اپنی تہذیب رہی ہیں۔ اس لیے ان چھوٹے ہوئے چھوروں کو پھر سے اپنے گاؤں میں مضبوطی سے اپنانا چاہیے۔

بڑے تالاب کو سدھارنے کے بعد پھر گاؤں میں اس سے پہلے بنے دو چھوٹے تالابوں کو بھی سدھارنے کا کام ہاتھ میں لیا۔ تینوں تالابوں نے یہاں ہونے والی برسات کو اپنے خزانے میں بھرنا شروع کیا اور پھر اسے گاؤں کے کنوؤں کے ذریعہ سے سال بھر تک استعمال میں لانے کا راستہ کھولا۔

ان تینوں تالابوں نے اپنے میں پانی سمیٹ کر گاؤں میں آرام بانٹنے کا جو راستہ کھولا تھا۔ اس کے لیے گاؤں نے شکریہ بھی ادا کیا۔ اس کتاب میں ذکر کیے گئے تالابوں کے نام رکھنے تہذیب کو سب سے پہلے زندہ کیا گیا۔ تینوں تالابوں کی خاصیت اور مزاج کو دیکھتے ہوئے ایک سادے اور بڑے جلسے میں ان کا نام رکھا گیا۔ پہلے تالاب کا نام رکھا گیا دیو ساگر، دوسرے کا نام پھول ساگر اور تیسرے کا نام انّ ساگر۔ پہلے دو تالابوں سے سماج کے لیے پانی نہ لینے کا قاعدہ بنایا گیا۔ پھول ساگر کے آس پاس اچھے پیڑ پودے جیسے سفید آکڑا، بیل پتر کے پودے اور بغیچی وغیرہ لگائی گئی۔ دیو ساگر کی پال پر چھتری، پن گھٹ، پرندوں کے لیے چگنے کی جگہ اور دھرم شالا وغیرہ کی بنیاد رکھی گئی۔ تیسرے سب سے بڑے تالاب سے گاؤں کی ضرورت کے مطابق سنچائی کا انتظام کیا گیا۔ پہلے دو تالابوں سے اپنے لیے نہیں، لیکن چرندو، پرندوں، پودوں کے لیے پانی لینا اور ان ساگر سے اپنے لیے پانی نکالنا طے کیا گیا۔ اپنے احسان اور دوسروں پر احسان کا ایک خوبصورت ڈھانچہ پھر کھڑا ہو سکا۔

گاؤں میں کھیتی کے حالات کچھ سدھر چلے تھے، لیکن کسانی صرف کھیتی پر نہیں ٹکتی۔ جانور پالنا اس کی ایک مضبوط بنیاد ہوتی ہے۔ لاپوڑیا کا گوچر پوری طرح سے اجڑ چکا تھا۔ دیکھ ریکھ کے بغیر گاؤں کی یہ عام زمین اب کسی کی نہیں رہی تھی۔ گوچر کی گھاس تو چھوڑیے، وہاں کے پیڑ بھی کٹ چلے تھے۔

گوچر کی سُدھ :

گاؤں کے لوگوں کا جو دماغ تالابوں کو سدھارنے میں لگا تھا، اب اس دماغ نے گوچر کو بھی ٹھیک کرنے کا عہد کیا۔ پھر سے چھوٹی چھوٹی بیٹھکیں شروع ہوئیں۔ کچھ موٹے موٹے فیصلے لیے گئے۔ اب گوچر میں کوئی کلہاڑی لیکر نہیں جائے گا۔ گھاس نہیں کھودی جائے گی۔ جنگلی جانوروں کو نہیں مارنا، ان کی پوری حفاظت اور گوچر میں ان کے لیے پانی کا انتظام اور گھونسلے اور انڈے دینے کی جگہ کو بچانے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ بڑے

تالاب ان ساگر میں تالاب کے بیچ بنے لاکھیٹا کو بھی انہیں سب وجوہات سے محفوظ رکھنے کا عزم لیا۔ گوچر کے پرانی شان کو یاد کیا گیا۔ کسی نے بتایا کہ ایک زمانہ میں اس گوچر میں اتنے پیڑ تھے کہ ان پر اس کونے سے اس کونے تک گاؤں کے نوجوان پیڑوں پر چلنے کی دوڑ میں حصہ لیتے تھے۔

گھاس اور استعمال میں آنے والے پیڑوں سے ڈھنکے ایسے گوچر کی بات، تب پھر سے ایک نیا خواب بن کر سامنے آئی۔ لیکن اسے پورا کرنا تالاب کے کام سے کہیں زیادہ مشکل تھا۔

گوچر کو سدھارنے کا عہد تھا۔ اس کا تجربہ کسی کے پاس نہیں تھا۔ اسی لیے بیٹھکوں میں طے ہوا کہ اس بارے میں جہاں کہیں سے بھی کچھ سیکھا جا سکتا ہو، اسے سیکھ کر لاپوڑیا میں اُتارنا چاہیے۔

ان دنوں سرکار کے ذریعہ کیے جا رہے گاؤں کے ترقی کے کاموں میں گوچر کی کہیں کوئی جگہ نہیں تھی۔ جو زمین عام استعمال کی تھی اب وہ صرف ایسی سرکاری زمین مانی جاتی تھی، جس پر چاہے جب، چاہے جو کوئی قبضہ کر لے۔ گوچر کو پھر سے ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ ایسا تجربہ کہیں تھا نہیں۔ پھر بھی لاپوڑیا کے جوان آس پاس معلومات حاصل کرنے کے لیے گھومتے رہے۔ کنٹور بنڈنگ کا ایک طریقہ انہیں بتایا گیا۔ لاپوڑیا کے لوگ کنٹور بنڈنگ کا کام دیکھنے گئے۔

اجمیر کے پاس تھہری نام کے ایک گاؤں میں عالمی بینک جیسی مشہور تنظیم کی مدد سے بھاری پیسہ بہا کر پانچ سال تک ایک گوچر کو بند رکھا گیا۔ اور یہاں جانوروں کو نہیں جانے دیا۔ گاؤں میں خوب تناسب رہا، لڑائی دنگے ہوئے اور بعد میں تو لوگوں نے گوچر کی باؤنڈری پر حفاظت کے لیے بنی کھائی کو بھر کر اپنے جانور گھسا دیئے تھے۔ سماجک انجینئرنگ کی ان کمیوں کو فی الحال بھول بھی جائیں تو یہاں ٹیکنیکل طور پر جو کام کیا تھا، اسے خود کائنات بھی یاد نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ پیسہ خوب تھا، اسی لیے سارا کام اطمینان اور ہاتھ کے بدلے ٹریکٹر سے کیا گیا تھا۔ ڈیڑھ فٹ کی اونچائی کے کنٹور ٹریکٹر کے کام کی وجہ سے اندر سے پولے تھے۔ پہلی برسات میں ہی یہ پانی کے دباؤ میں دیکر چھانچ کے ہوگئے اور پھر تیز بہتا پانی ان کو توڑ کر گوچر کی ترقی کا سارا کام اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔

اسی طرح کے ایک اور کام میں گوچر میں ٹرینچ یا کھائی بنا کر نمی لانے کی خواہش کی گئی تھی۔ یہاں بھی کامیابی ہاتھ نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آئی کہ برسات کے دوران کھائی میں پورا پانی بھر جاتا ہے۔ ایسے میں اس میں گھاس نہیں پنپ پاتی۔ پھر گرمی کے دنوں میں یہ پانی تیزی سے اڑنے لگتا ہے اور کھائی کی گہرائی سے جڑی زمین کی پرتوں میں سمائی جا چکی نمی بھی اسی تیز ٹیمپریچر کے دوران واپس تیزی سے سوکھنے لگتی

ہے۔ یہ تجربہ اگر کامیاب بھی ہوتا تو لاپوڑیا کو اس میں کچھ دیگر کمیاں بھی دکھی تھیں۔اس کام کے لیے کافی وقت تک گوچر کو بند کر کے رکھنا پڑتا۔ پھر جو کنٹور بنائے گئے تھے وہ گوچر سے آس پاس کے گاؤں سے نکلنے والے راستوں کے بیچ آتے تھے۔اپنا گاؤں اس رکاوٹ کو تسلیم بھی کر لیتا تو دوسرے گاؤں والے بھلا اسے کیوں مانتے؟ پھر کچھ وقت کے لیے گوچر بند کرتے تو گاؤں کے جانور کہاں جاتے؟

برسوں کی پیاس:

ایسے بہت سے سوالوں کا جواب نہ بیٹھکوں میں ملا اور نہ آس پاس دیکھے گئے کاموں سے ملا۔لیکن لاپوڑیا کے لوگ اجڑے پڑے گوچر کے چکر لگاتے رہے۔ایسے ہی کسی وقت شری لچھمن سنگھ کو سوجھا کہ گوچر میں برسنے والے پانی کو وہیں کے وہیں اندر ڈالکر اس کی برسوں پرانی پیاس بجھانی چاہیے اور یہ کام کچھ اس ڈھنگ سے ہو سکے کہ نہ جانور رکیں اور نہ راستہ۔ گوچر کھلا رکھا جائے، پانی اس طرح سے روکا جائے کہ گاؤں کا زمین کے اندر کا پانی بھی بڑھے اور پھر نمی بڑھنے سے گوچر ہرا ابھرا بنے۔

کھیتی کا تجربہ گوچر میں:

گوچر کی سار سنبھال کرنے کی خواہش رکھنے والے ان لوگوں کے پاس اپنے کھیتوں میں پانی کے انتظام کا، سنچائی کا، نمی پھیلانے کا تجربہ تو پیڑھیوں سے تھا۔لیکن گوچر کھیت نہیں ہے۔اس میں گھاس، جھاڑی، پیڑ، پودے پنپانے کے لیے اب جو کچھ بھی طریقہ اپنانا تھا، وہ ان کے ہاتھ میں نہیں تھا۔اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ گوچر میں اس سے پہلے ایسا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ انہیں گوچر پیڑھیوں سے ہرا بھرا ملا تھا۔لیکن پچھلے دور میں یہ سب اجڑ گیا تھا۔اس میں کوئی نہیں سوجھ بوجھ لگائے بنا پانی ٹھہرنے والا نہیں تھا۔

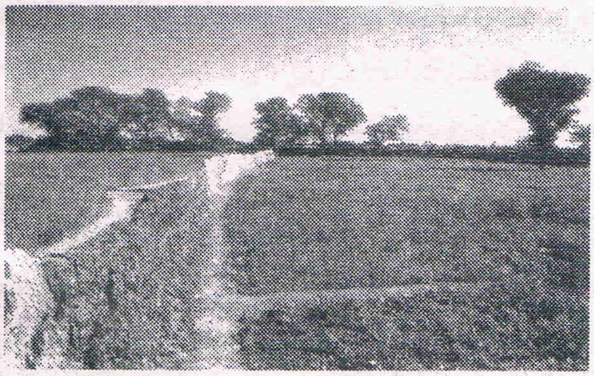

کسانی کے تجربہ نے اتنا تو بتا ہی دیا تھا کہ گوچر میں پانی کو ٹھہرانا ضروری نہیں ہے۔ پانی اکٹھا تالاب میں ہوتا ہے۔ یہاں تو برسات کے دوران فوراً بہہ جانے والے پانی کو تھوڑی دیر کے لیے تھامنا ہے۔ پورا پانی

روک لیں تو گھاس اچھی نہیں ہوتی۔کائنات کو اتنی نمی بھر چاہیے کہ وہ گوچر زمین میں گھاس کی ملائم جڑیں جما سکے۔ایک بار گھاس جم جائے تو اسے بعد کی برسات میں پھر اتنا پانی، اتنی نمی چاہیے کہ وہ سورج کی روشنی کے ساتھ اس نمی کو جوڑ کر گھاس کو اور اوپر اٹھا سکے۔

چوکا لگا ہاتھ:

گوچر میں کیا نہیں کرنا چاہیے اور کیا کیا کرنا ہے۔ان دونوں کا پورا دھیان رکھ کر ''بنا جی'' نے پہلی بار چوکا لفظ کھوج نکالا۔لیکن جب اس چوکا طریقہ کو گوچر میں اتارا تو چوکے کے چار بازو میں سے ایک بازو ہٹا دیا۔اب یہ چوکا ایک بڑا بازو اور دو چھوٹے بازوؤں کی شکل لے بیٹھا۔ممکنہ طور پر گوچر ترقی کے ماضی میں یہ ''بنا جی'' کی دین کی طرح درج ہونے لائق واقعہ تھا۔اس ڈھانچہ میں اب تین بازو اور دو کونے تھے۔لیکن برسات میں جب پانی بھریگا تو یہ ایک لمبی آیت یعنی چار کونوں کی شکل لے لیگا۔اسی لیے نام چوکا ہی رہا۔

اجڑ چکے گوچر کو پھر سے ٹھیک کرنے کے لیے مضبوط عزم کے ساتھ ساتھ پوری احتیاط برتی گئی۔یہ جوان گاؤں کے بزرگ لوگوں کے ساتھ پورے گوچر میں دو چار بار گھومے۔اس سے پتہ چلا کہ ڈھال کس طرف ہے، کتنا ہے۔پھر دیکھنا تھا کہ سارے گوچر میں چوکا بن جانے کے بعد ان میں سے بہنے والا پانی نکل کر اس جگہ آئے گا۔اس علیحدہ پانی کو وہاں کسی تالاب یا ناڈی میں ڈالنا تھا۔جہاں جانور چریں، وہیں پاس میں پانی چاہیے۔اگر پانی دور ہوا تو دوپہر کو پانی پینے دور جانا پڑے گا۔اور پھر دوبارہ واپسی مشکل ہوگی۔

بزرگ لوگوں کے ساتھ گوچر گھومنے سے یہ سب باتیں اچھی طرح سے دھیان میں آ گئی تھیں۔

تب پھر کاغذ پر ایک کچا نقشہ بنایا گیا۔پھر گوچر میں کام شروع کرنے سے پہلے اس نقشہ کے مطابق زمین پر بھی نشان لگائے گئے۔کہاں سے کتنی مٹی اٹھے گی اور کہاں کیسے پڑے گی، اسے دیکھا پرکھا گیا۔کھدائی اور پٹکائی والی جگہ میں کوئی پانچ فٹ کا فرق چھوڑا، تاکہ پٹکائی سے بنی میڑ یا دیوار پر پانی کا دباؤ نہ پڑے اور یہاں کی مٹی بھی دھیرے دھیرے کھسک کر کھدائی والی چوکڑی میں واپس نہ بھر جائے۔اَنتر اور اَنترا لفظ سبھی نے سنا ہے۔لیکن یہاں اَنترا کے ساتھ سنترا لفظ بھی واپس آیا ہے۔اَنترا چوکڑی اور میڑ کے بیچ کا فرق ہے اور سنترا کھدائی کی جگہوں کے بیچ چھوڑی گئی دوری کو کہتے ہیں۔اس کا پورا دھیان رکھا گیا۔

اتنا سب ہو جانے کے بعد چوکے کی باری آئی۔اسے بنانے سے پہلے سب کے ساتھ بات چیت کی گئی۔سب کے من میں کاغذ اور زمین پر کھینچی لکیریں، نقشہ ٹھیک سے بسایا گیا۔

گھاس سے پہلے سیاست پنپی :

آج ہمارے گاؤں جس طرح سے ٹوٹ چکے ہیں، ان میں چوکے کے ذریعہ سے پورے گاؤں کو، کسانوں کو، جانور پالنے والوں کو جوڑنے کا کام چٹکی بھر میں ہو جاتا، ایسا مان لینا بہت بھولا پن ہوگا۔ اس کام کو شروع کرتے ہی گھاس پنپنے سے پہلے گاؤں میں گندی اور خودغرض سیاست پنپ اٹھی۔ پورے گاؤں کی ایکتا کو توڑتے ہوئے کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے چوکے کی مخالفت کی۔ افواہ پھیل گئی کہ تنظیم کے لوگ گوچر پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ بچے کھچے پیڑوں کا نہ کاٹنے کا جو عہد گاؤں نے لیا تھا، اسی پر ان لوگوں نے کلہاڑی ماردی۔ چنے ہوئے رہنما گاؤں کی پنچایت ان کے ساتھ ہوگئی۔ پنچایت نے ۱۶ ستمبر ۱۹۹۵ء کو صرف دو ہزار روپیہ میں پورے گوچر میں کٹائی کا ٹھیکا اٹھا دیا۔ یہ بھی اطلاع انہوں نے دی کہ گوچر کو سدھارنا ہے، اس کی ترقی کرنا ہے تو یہ کام گرام پنچایت ہی کرے گی۔

لیکن سچ گاؤں کے ساتھ تھا، تنظیم کے ساتھ تھا، اسی لیے اس بیحد ناپسندیدہ واقعہ میں لوگوں نے سچ کی التجا بھی جتا دی۔ گوچر میں ستیہ گرہ شروع ہوا۔ سردی کے دن تھے۔ دن بھر آدمی عورت پورے گوچر میں گھوم گھوم کر اس کی رکھوالی کرنے لگے۔ لیکن دن کی رکھوالی کافی نہیں تھی۔ تب گوچر بچانے والے لوگ سردی کی رات میں اپنے گھروں کو چھوڑ کر رضائی اور کمبل لیکر گوچر میں سوئے۔ دور جدید میں پورا گاؤں چین کی نیند سو سکے، اس کے لیے ۱۹۹۵ء کی سردی میں گوچر کے یہ رکھوالے کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے رہے اور باری باری سے پہرا دیتے رہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کے ساتھ جوان، عورتیں اور گھر کے چھوٹے بیٹے بیٹیوں نے بھی اپنے دادا، کاکا، باپ اور ماں کا ساتھ دیا۔ پھر پولس آئی، کلکٹر آئے، چھوٹے۔ بڑے آفیسر، پٹواری آئے۔ سب نے دونوں پارٹیوں کے ساتھ بیٹھ کر سارے حالات سمجھے۔ گوچر میں پیڑ کاٹنے کا ٹھیکہ خارج کیا گیا۔ اس کے بدلے طے ہوا کہ گوچر کے لیے نقصاندہ پیڑ ولایتی ببول ہی کاٹا جائے گا۔ زمین کا بھلا کیا تو ثواب ملا اور گوچر بچ

گیا۔

اس بیٹھک میں فیصلہ لیا گیا کہ گوچر پر سے قبضے بھی ہٹیں گے۔ پٹواری زریب لیکر اس کام میں آگے آئے۔ گاؤں کے نقشے کی بنا پر پوری ناپائی ہوئی اور اس میں نہ رشتوں کا دھیان رکھا گیا اور نہ دوستی کا۔ لچھمن جی نے پورے پیار کے ساتھ، لیکن پورے عہد سے بتا دیا تھا کہ دوستی صرف گوچر سے ہے، کیونکہ اس گوچر سے پورے گاؤں کی خوشحالی جڑی ہے۔

برسوں کا قبضہ چھڑانا آسان کام نہیں ہوتا۔ جس کا قبضہ ہٹایا جاتا ہے، اس کے من میں بہت کڑواہٹ آجاتی ہے۔ اس کڑواہٹ کو دور کرنے کے لیے گوچر میں ہی پورے گاؤں کا اجتماعی کھانا رکھا گیا۔ پوری کے ساتھ شیرا کھلایا گیا۔ گاؤں کے ۲۰۰ گھروں سے کوئی ۴۰۰ لوگوں نے کھانا کھلایا۔ کھانے میں کھلائے گئے میٹھے سیرے نے ساری کڑواہٹ مٹا دی۔

ولایتی ببول ہٹانے کا دیسی ابھیان:

اسی کھانے کے بعد گوچر سے ولایتی ببول ہٹانے کا کام شروع ہوا۔ سبھی لوگ جانتے ہیں کہ گوچر گاؤں کے جانوروں کے چرنے کی جگہ ہے۔ لیکن پچھلے دور میں گوچر کے پیڑ کٹ گئے تھے۔ گھاس کھود لی گئی تھی۔ پھر اس طرح کی غلطی کو چھپانے کے لیے سوکھے اور اجڑے گوچروں میں یہاں وہاں ہرا رنگ بکھیرنے کے لیے، ہریالی دکھانے کے لیے کچھ وقت پہلے ولایتی ببول لگایا گیا تھا۔ یہ لاپوڑیا کے گوچر میں بھی آجما تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ جلدی بڑھتا ہے، لیکن کوئی بھی جانور اسے کھاتا نہیں ہے۔ پھر اس کے آس پاس کوئی دوسرا استعمال میں آنے والا پودا بھی نہیں پنپ پاتا۔ ہر موسم میں اس کی پھلیاں چاروں طرف بکھرتی ہیں اور

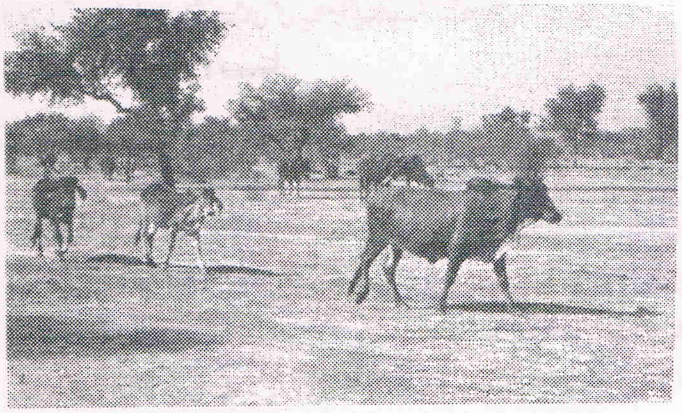

ولایتی ببول کا رقبہ بڑھتا جاتا ہے اور پورے گوچر کو اپنا غلام بنا لیتا ہے۔ اسی لیے اس اجتماعی کھانے کے بعد ولایتی ببول کو پورے گاؤں سے ہٹانے کا خوبصورت

دیسی کام بھی شروع ہوا۔

گاؤں کے لوگوں نے پورے گوچر میں گھوم کر ولایتی ببول کی گنتی کی۔ پھر اس گنتی کو گاؤں کے کل گھروں میں بانٹا۔ کوئی چھ سو پیڑ پودے ولایتی ببول کے تھے اور گاؤں میں ۲۰۰ گھر تھے۔ طے کیا گیا کہ ہر گھر کو تین ولایتی ببول جڑ سمیت اُکھاڑنا ہے۔ اس پیڑ جھاڑی کا ذرا سا حصہ بھی چھوٹ جائے تو اسے پھر سے بڑھنے میں دیر نہیں لگتی۔ اس لیے بغیر دیر کیے اگلے چھ مہینے میں گوچر سے اسے ہٹانا طے ہوا۔ جڑ سمیت کھودنے کے بعد جو گڈّے نکلے، ان میں انہیں پریواروں نے دیسی ببول، بیر، طرح طرح کی استعمال میں آنے والی گھاس کے بیجوں کو بویا۔

شروع کے دنوں میں چوکا بنانے کے بعد خوشی میں باہر سے پودے اور طرح طرح کی گھاس کے بیج بھی لا کر لگائے گئے۔ لیکن ان کے نتیجے بہت اچھے نہیں نکلے۔ گوچر میں جتنا ضروری تھا، اتنا پانی روکا گیا تھا۔ باقی علیحدہ پانی چوکوں کو بنا توڑے آگے بہتا رہا تھا۔ اسی لیے بھلے ہی باہر سے لا کر بوئے گئے بیج انکورت نہیں ہوئے، لیکن بنا بوئے بیجوں نے تر ہوئی گوچر کی زمین میں اپنا سر اٹھا کر اسے ہرا بھرا کرنا شروع کر دیا۔ برسات کے دنوں میں پورے گوچر میں جیسے پانی چلتا، اس کے سوکھتے ہی نمی والی اس جگہ پر کائنات طرح طرح کی گھاس سے ہرے رنگ کی جاضم دری بچھا دیتی۔ پچھلی کچھ پیڑیوں نے گھاس کی جو شکل کھودی تھی، ان کی یاد اور بولیوں میں گھاس اور جھاڑیوں کے جو نام غائب ہو گئے تھے، وہ ایک ایک کر لاپوڑیا کے گوچر میں لوٹنے لگے۔ ولایتی ببول ہٹا دیا گیا، دیسی ببول بویا نہیں گیا تھا، لیکن نمی ملتے ہی پرانی دبی جڑوں میں جان آ گئی اور جگہ جگہ استعمال میں آنے والی گھاس، پودے اور جھاڑیاں بڑھنے لگیں۔ کائنات کی یاد میں یہ مٹا نہیں تھا، اسی لیے پھر لاپوڑیا کے سماج کی یادداشت میں بھی یہ نام ایک ایک کر کے واپس آنے لگے۔

عزم کو بڑھاوا دینا:

اپنے گوچر کو سدھارنے کے اس عزم کو لاپوڑیا نے کام میں بدلا اور عزم کو بڑھایا۔ آس پاس کے سبھی گاؤں میں یُوا منڈل بنائے گئے۔ سبھی سے رابطہ قائم کیا گیا اور گوچر، تالاب، پیڑ، پودے اور جنگلی جانوروں کو بچانے کے لیے بیٹھکیں کی گئیں۔ پیدل سفر کیے گئے۔ آس پڑوس کے گاؤں سے شروع ہوا یہ کام بعد میں اور آگے بڑھ کر ۸۴ گاؤں میں پھیل گیا۔ دیو اٹھنی گیارس سے تالاب اور گوچر کی پوجا کا کام شروع ہو جاتا ہے، اور پھر جگہ جگہ ایسے پیدل سفر، عام لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ سب کا کام سب کو ساتھ لیے بنا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے گوچر آندولن میں ہر جگہ اس بات کا دھیان رکھا گیا ہے کہ کوئی چھوٹ نہ جائے۔

آج اگر کوئی لالچ میں آکر اس کام میں شامل نہیں ہو رہا ہے تو یہاں پورا صبر رکھا گیا ہے۔ اسے سمجھایا گیا ہے کہ اس کا بھی فائدہ عام فائدے سے ہی جڑا ہوا ہے۔

لاپوڑیا واپس لوٹیں۔ شروع سے ہی پورے گاؤں کو گوچر سے جوڑنے کی چال اور انتظامات کیے گئے۔ ابھی پیڑ نہیں تھے، لیکن چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں مضبوط ہونے لگی تھیں، انہیں اور زیادہ سہارا دینے کے لیے ماحول بنایا جانا تھا۔ اسی لیے ان جھاڑیوں کی رکھوالی کے لیے قانون یا سختی کے بدلے پیار اور عقیدت کا سہارا لیا گیا۔ لاپوڑیا گاؤں کے آدمی عورتوں نے ان چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کو راکھی باندھی اور ان کی حفاظت کا عہد کیا۔ شاید ان جھاڑیوں نے بھی من ہی من لاپوڑیا کی حفاظت کرنے کا عہد کر لیا تھا۔

تبھی تو آج ۶ سال کے سوکھے کے بعد بھی لاپوڑیا میں اتنا چارا ہے، اتنا ہرا چارا ہے، جانور اتنے خوش ہیں کہ یہاں سوکھے کے بیچ میں بھی دودھ کی بڑی ندی نہ سہی، لیکن ایک چھوٹی ندی تو بہہ ہی رہی ہے۔ آج لاپوڑیا میں ہر روز ۴۰ کین یعنی کوئی ۱۶۰۰ لیٹر دودھ ہو رہا ہے۔ گھر پریوار اور بچوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے بعد ہی دودھ بیچا جاتا ہے۔ جے پور ڈیری یہاں سے ہر مہینہ ڈھائی لاکھ روپیہ کا دودھ خرید رہی ہے۔ اس طرح آج لاپوڑیا ہر سال تقریباً ۳۰ لاکھ روپیہ کا دودھ پیدا کر رہا ہے۔ اور یہ دودھ گاؤں میں لوٹی ہریالی سے ہے۔

اُجڑے ہوئے گوچر میں آج چوکا طریقہ کی وجہ سے نہ جانے کتنی طرح کی گھاس اور طرح طرح کے پودے واپس آئے ہیں۔ ان سب کی گوچر میں اپنی اپنی خاص جگہ طے ہو رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کائنات ان کی جگہ بچا کر چل رہی ہے۔ کہیں پسر کٹیلی ہے، تو کہیں اونٹ کٹیلا، کہیں خرگوش چونٹی ہیں، تو کہیں گندیل اور لاپڑا تو کہیں جھیرڑا۔ اب گوچر میں لوگ داخل ہوتے ہیں تو اُمنگ کے ساتھ نکل رہی ہر کونپل کو، پتی کو، انکر کو پہچاننے کی، نام بتانے کی یا نام پوچھنے کی خواہش کرتے ہیں۔ لاپوڑیا کا گوچر Botany کی ایک کلاس بن گیا ہے۔ آپس کی بات چیت میں کسان، جانور پالنے والے اور گوالوں کی ٹولی میں نئے ناموں کو پہچاننے اور کھوجنے کی ہوڑ سی لگ گئی ہے۔ کوئی بتائے گا کہ اس گھاس کا کیا نام ہے، تو کوئی اس کی خاصیت اور فائدے بتائے گا۔ تو کوئی سب کے آگے بڑھ کر اس گھاس کے نیچر کا خلاصہ کرے گا۔ جیسے وہ اس کے پریوار کا فرد ہو۔ ''گانٹھ۔ گنٹھیلی گھاس کو دتے چلتی ہے۔'' یہاں اب پرانی قسموں کے اتنے سارے نام اکٹھا ہو گئے ہیں کہ نئے زمانے کے نام جیسے اسٹائیلو، دھامن اور رجکا پیچھے چھوٹ جاتے ہیں۔

گھاس کے ساتھ ساتھ پھر لاپوڑیا گاؤں کا دھیان گوچر اور گاؤں میں پیڑوں پر گیا ہے۔ ولایتی ببول پورے گاؤں نے مل کر گوچر سے ہٹا دیا تھا۔ اب کائنات کو تھوڑی راحت ملی تھی، اسی لیے گوچر میں نمی پاتے

ہی دیسی ببول، رونجھ، کھیجڑی، کیر، جال، جہاں جو ممکن ہوا دھیرے دھیرے پنپنے لگا۔ کائنات میں تیزی سے بڑھنے والے پیڑوں کی کوئی خاص جگہ نہیں ہوتی۔ یہ صبر کا کام ہے۔ اسی لیے لاپوڑیا گاؤں نے اپنا صبر نہیں کھویا اور جو پیڑ آنے لگے تھے، انہیں بچانے اور بڑھنے کا موقع دینے کا ماحول بنایا۔ لیکن اس کے لیے جانور کو روکا نہیں۔ گاؤں نے مانا کہ اس انتظام میں دشمن نہیں ہیں۔ وہ ہیں اور ان کی دوستی گوچر ہرا بھرا بناتی ہے۔ گائے، بکری اور خرگوش کی مینگنی اپنے میں طرح طرح کی گھاس اور پیڑوں کے بیج لیے رہتی ہے۔ چرندے پرندے کے پیٹ کی مشینری ان کے سخت خول کو نرم بناتی ہے اور مینگنی وغیرہ کی شکل میں ان بیجوں کے آس پاس کھاد باندھتی ہے۔ پورے گوچر میں بکھری مینگنی چوکے میں پانی بھرنے، بہنے اور پھر یہاں وہاں آنے جانے کی وجہ اپنے اپنے بھار کو دیکھتے ہوئے تیرتی ہیں اور صحیح موقع دیکھ کر ٹھہر جاتی ہیں۔ پھر نمی اور دھوپ ان کے انکورن میں مددگار بنتی ہے۔

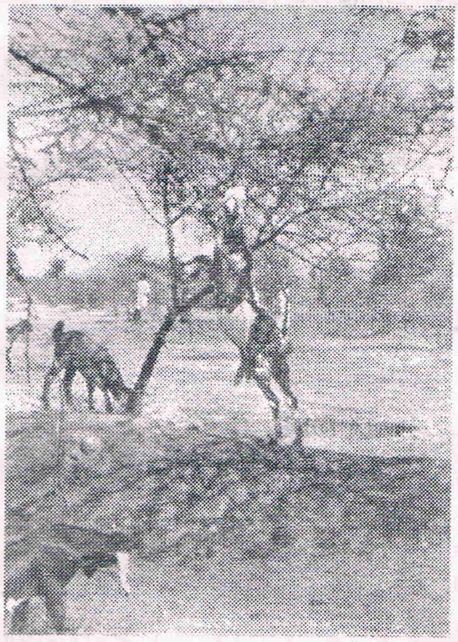

ذرّہ سے مکمل کی واپسی:

لاپوڑیا میں گوچر بڑھنے کے ان شروعاتی کاموں کے ساتھ ساتھ لوگوں کا دھیان گوچر کے پورے انتظام کی اور بھی جانے لگا ہے۔ گاؤں پچھلے دور میں جس تہذیب کو، جس معلومات کو اور جس ادب کو کھو بیٹھا تھا، بھلا بیٹھا تھا، اب اس کا تھوڑا سا انش جب واپس آنے لگا، تو اس کی مکمل شکل، مکمل دکھنے کی یاد بھی لوٹنے لگی ہے۔

آج لاپوڑیا میں جانوروں کی تعداد بڑھی ہے۔ پرندوں کی تعداد بھی بڑھی ہے اور ان کی ذات بھی۔ اسی طرح جنگلی جانوروں کی موجودگی بھی دکھنے لگی ہے۔ مور، کویل، پپیہا، نیولہ، جنگلی بلی، گلہری، جھاموسہ اور طرح طرح کے دوست کیٹ پتنگے کھیتوں اور گوچر میں عام طور پر ملنے، دکھنے لگے ہیں۔ گاؤں میں

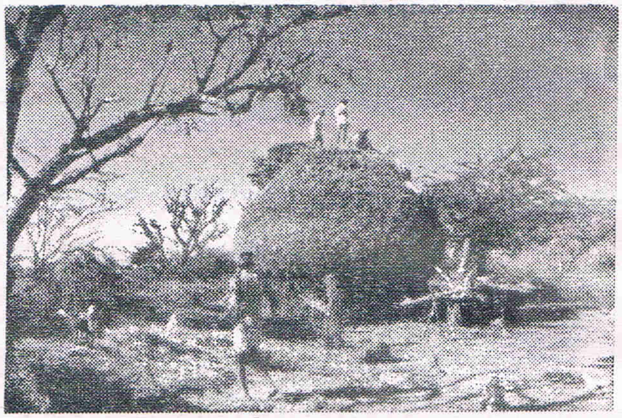

مکانوں پر، دیواروں پر چرندوں پرندوں کی جو تصویریں بنائی جاتی تھیں، آج وہ دیوار سے اتر کر گاؤں میں پھیل گئے ہیں۔

گاؤں میں اب بیگسا کی بات ہوتی ہے۔ بیگسا یعنی گاؤں اور گوچر کے بیچ جانوروں کے بیٹھنے کی، اکٹھا ہونے کی یا آرام کرنے کی جگہ۔ کچھ جگہوں میں بیگسا کو گوٹھان بھی کہا جاتا ہے، جو سنسکرت لفظ 'گوستھان' سے بنا ہے۔ راجستھان کی ان جگہوں میں برسات کم ہی ہوتی ہے۔ اسی لیے روایتی طور پر یہاں کے کسان کھیتی کے ساتھ ساتھ جانور پالنے پر پورا دھیان دیتے رہے ہیں۔ جانور ان کے لیے صرف کمائی کا ذریعہ نہیں تھے۔ یہ ان کے سانسکرتک اور دارشنک سماج کے زندہ فرد تھے۔ اسی لیے انہیں یہاں سے وہاں ہانک کر نہیں لے جانا ہے۔ اس کا پورا پلان بنایا گیا تھا۔ بیگسا اسی بڑے انتظام کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا۔

اکثر ہر گھر میں جانور ہوتے تھے، لیکن اس گھر کے فرد جانوروں کے ساتھ خود گوچر نہیں جا پاتے تھے۔ اس ذمہ داری کو گاؤں کے گوالے نبھاتے تھے۔ ہر محلّہ اور ٹولے سے گوچر میں جانے والے جانوروں کا جھنڈ دھیرے دھیرے نکلتا۔ کسی گلی میں پانچ دس جانور نکلتے تو کہیں سے بیس تیس۔ یہ سب گاؤں سے گوچر کے راستہ میں گاؤں کے پاس بنے 'بیگسہ' میں بٹھا دیئے جاتے تھے۔ پھر جب سب گوالے اپنے اپنے جانوروں کے ساتھ آجاتے، تو پھر سب ایک ساتھ گوچر کی طرف بڑھتے۔

لیکن آج جب گاؤں میں گوچر ہی نہیں بچا ہے، تو کس گاؤں میں بیگسا یا گوٹھان مل پائے گا؟ کبھی لاپوڑیا میں بیگسا پینتیس بیگھا میں تھی، لیکن پھر دھیرے دھیرے گوچرا اجڑا اور پھر اسی کے ساتھ بیگسا بھی۔ پرانی پیڑھیوں نے گاؤں کے پاس ہی اتنی بڑی جگہ جانور سماج کے آرام کے لیے چھوڑی تھی۔ لیکن نئی نسلوں کو یہ قیمتی جگہ کی بربادی لگی ہوگی۔ اسی لیے اس پر بھی قبضے ہوتے گئے۔ آج جن پنچایت کے ہاتھ میں گاؤں کی ترقی کی ذمہ داری ہے۔ وہاں کا رہنما اس قیمتی جگہ کو کمٹھی، دوکان یا ہاٹ بازار میں بدلنے کے لیے بے قرار ہے۔ لیکن لاپوڑیا پھر سے ''بیگسا'' کو بھی بچانے کا من بنا رہا ہے۔

جانور رکھنے میں اضافہ:

اس پورے انتظام کے بڑھاوے میں جائیں تو سمجھ میں آئے گا کہ گاؤں کا ہمارا کسان سماج کتنا ایک جٹ تھا۔ کہیں کہیں گاؤں سے گوچر کا راستہ بالکل الگ رکھا جاتا تھا۔ یہ لوگوں کے پیدل چلنے یا بیل گاڑی چلانے والے راستوں سے دور رہتا تھا۔ ایسے راستوں کو کانکڑ کی گیلی کہا جاتا تھا۔ گوالے ہر گھر سے جانور نکالتے اور پھر گیلی سے بیکسا ہوتے ہوئے گوچر جاتے۔ گوالوں کی محنت جانوروں کی گنتی کے مطابق عام طور پر اناج میں اور کبھی کبھی پیسہ کی شکل میں بھی ملتی تھی۔ اسی بندھی آمدنی کے علاوہ سال بھر آنے والے تیج تہواروں پر کسان پریوار گوالوں کو کپڑا، چھتری، جوتے، اپنی اپنی حیثیت سے دیتے تھے۔ دیوالی پر گوالوں کے ناچ کی خاص اہمیت تھی۔ بچھی پوجن آج سب کو معلوم ہے، لیکن اسی دن گو پوجن بھی ہوتا تھا۔ گودھن سے ہی بچھی آتی تھی۔ دیوالی کی صبح پورے گاؤں کو جگانے کا کام سریلے گیت گا کر گوالے ہی کرتے تھے۔ گاؤں میں اسی دن یا کہیں کہیں دشہرے کے دن بیلوں کو سجایا جاتا، ان کی دوڑ ہوتی اور کہیں کہیں بیلوں کی لڑائی بھی۔ ان کچھ خاص دنوں میں گائے بیلوں کو الگ سے پکوان بھی بنا کر کھلائے جاتے تھے۔

انہیں دنوں موسم بدلتا، فصلیں کٹتیں اور کھیت خالی ہو جاتے تھے۔ تب کئی گاؤں کے دائرے میں خالی کھیت بیل گاڑیوں کی دوڑ کا میدان بن جاتے۔ ایسے جلسوں سے پہلے السی اور گڑ کے لڈو، گڑ دلیا اور کہیں کہیں تو گھی بھی بیلوں کو پلایا جاتا تھا۔ کھیتی ہر معاشرہ اپنی بنیاد بیل اور گائے کو مانتا تھا اور اس پر کسانوں کی پوری شان ہوتی تھی۔

لاپوڑیا اور اس کے آس پاس کے کئی گاؤں میں آج بھی بیلوں کے زور آزمائش کے کھیل ہوتے ہیں۔ یہاں کہیں بھی چلتے پھرتے آپ کو ایک ایسا بڑا سا چھوا ہوا پتھر پڑا ہوا دکھے تو سمجھ لیں کہ یہ گھاس بابا ہے۔ یہ لفظ پتھر کو گھسیٹنے، گھسینے سے بنا ہے۔ ایک خاص دن اکثر دیوالی کے دوسرے دن گاؤں کے سب پریوار اپنے اپنے بیلوں کی زور آزمائش کرنے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ بیل کے پیچھے اس پتھر کو باندھا جاتا ہے اور وہ بیل اسے لیکر کتنے دور جاسکتا ہے۔ اس کا امتحان ہوتا ہے۔ جو بیل سب سے زیادہ دوری طے کرتا ہے، اس کو انعام ملتا ہے اور پھر سال بھر تک اس بیل کی اور اس کے مالک پریوار کی گاؤں میں خاص حیثیت بنی رہتی ہے۔

تصور کیجئے اس ڈھانچہ کا جس میں کھیتیہر سماج اپنے جانوروں کا اتنا زیادہ دھیان رکھتا تھا۔ تب آج کی طرح دودھ کا کاروبار نہیں تھا، ڈیری کا انتظام نہیں تھا۔ نہ دودھ اکٹھا ہوتا تھا اور نہ دودھ بکتا ہی تھا۔ دودھ کی مشابہت پوت سے تھی۔ اور دونوں کو بیچنا اچھا نہیں مانا جاتا تھا۔ تب ان گاؤں میں دودھ کی ندیاں کیسے بہتی

تھیں، اس بات کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

گوچر مکمل کا ایک ذرّہ:

آج جب گوچر کی طرف پھر سے دھیان جا رہا ہے، تب اس بات کو بھی یاد دلانا چاہیے کہ ہمارے گاؤں کے سماج نے اپنے جانوروں کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک خیالی ڈھانچہ کھڑا کیا تھا۔ گوچر اس کا ایک حصہ تھا۔

لاپوڑیا کا ہی ماضی دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ یہاں تقریباً ۳۲۰ بیگھے میں گوچر کے علاوہ اسی سے ملتے جلتے کام کے لیے ایک چھوٹا بیڑ، ایک بڑا بیڑ اور چیلی نام کی جگہ محفوظ رکھی گئی تھی۔ گوچر میں گائے اور دیگر چھوٹے جانور چرنے کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ وہاں کے چارے کی شکل اور خاصیت ایسے ہی جانوروں کے جسم کی کاٹھی اور ان کے کردار کے حساب سے طے کیے جاتے تھے۔ لیکن بیڑ میں زیادہ بڑا اور فائدہ مند چارا ہوتا تھا اور ان سب جگہوں کا سال بھر کا موسمی پہیہ یا کلینڈر بنا رہتا تھا۔

برسات ہوتے ہی پورے گاؤں کے بیل چوئیلی میں بھیجے جاتے تھے۔ یہاں پیڑ پودوں کا چارا مہیہ ہوتا تھا۔ پچاس بیگھے کی اس چوئلی میں کسی ایک پریوار کے نہیں، زمیدار یا ٹھکانیدار پریوار کے نہیں بلکہ گاؤں کے سبھی پریواروں کے بیل چھوڑے جاتے تھے۔ برسات میں اٹھا یہ چارا دیوالی تک تھوڑا کمزور ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد چوئیلی کے بیل بیڑ میں بھیجے جاتے اور بیلوں سے خالی ہوئی چوئیلی میں اب گائے اور بکری کی باری آتی۔ چوئیلی میں چرائی پوری طرح سے بغیر دام کی تھی، لیکن بیڑ میں چہرے کی شکل میں، صرف نام کا دام لیا جاتا تھا۔ اور یہ راج میں جمع ہوتا تھا۔ اس طرح جمع کی گئی یہ رقم انہیں جگہوں کی دیکھ ریکھ کے مد میں خرچ کی جاتی تھی۔ ہولی کے بعد گرمی کا موسم آنے لگتا اور تب ان علاقوں سے چارا کاٹ کر کٹی ہوئی جگہ میں بھی جانوروں کو رکھا جاتا تھا۔ اس دوران لوگ اپنے اپنے کھیتوں میں بھی کچھ چارا لگا کر رکھتے تھے۔ اس خزانہ کا استعمال ہوتا۔ پھر جولائی سے دیوالی تک گائیں گوچر میں آجاتیں۔

اس پورے انتظام میں ہر جگہ کو پورا آرام دینے کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ وقت کا بٹوارہ اس طرح سے کیا جاتا کہ کھلی چرائی سے پہلے اس خاص جگہ میں لگی گھاس یا چارا ٹھیک سے پنپ جائے۔ اس میں پھول اور پھل یعنی بیج آجائیں۔ نئے بیج پھر سے گر جائیں۔ جڑیں جم جائیں تاکہ آج اس کے استعمال کے بعد کل اس کی دوسری فصل اپنے آپ آجائے۔ اس سبھی جگہوں میں موسمی پہیہ کے مطابق الگ الگ ذات کی گھاس اور چارا محفوظ رکھا جاتا تھا۔ گرمی کی دوب گرمی میں ہی پھیلتی ہے۔ لیکن برسات میں یہ نہیں پھوٹتی۔

ساواں گھاس نام کا چارا برسات کے اچھے پانی میں بھی کھڑا رہے گا۔

مالک بھی خادم بھی :

گاؤں کی روایت میں ذاتی دولت اور عام دولت کا بہت باریکی سے بانٹا گیا تھا۔ عام دولت کے لیے گاؤں میں چلنے والا لفظ ''شام لات دیح'' ہے۔ یہ فارسی لفظ شامل اور دیہات سے مل کر بنا ہے۔ معنی صاف ہیں۔ جس میں پورا گاؤں شامل ہو، جس کا مالک پورا گاؤں ہو۔ لفظی معنی کے علاوہ اس میں یہ نیت بھی چھپی رہتی تھی کہ اس میں سارا گاؤں مالک تو ہے ہی، لیکن اس کی رکھوالی سارا گاؤں خادم کی طرح کرے گا۔

مالک اور نوکر کے کردار میں کسی طرح کی چوک نہ ہو، اس لیے بہت مضبوط رولس بنائے گئے تھے۔ لیکن ان رولس پر پہرا دیتی تھی عقیدت۔ سزا کا بھی طریقہ ضرور تھا۔ لیکن شام لات دیح کی رکھوالی عقیدت پر ٹکی تھی۔ اس کا بہت خوبصورت نمونہ ہے گُراڈ نام کا گاؤں۔

گُراڈ گاؤں میں آج بھی پرانی روایت کے حساب سے ایک بڑے گوچر کی رکھوالی ہو رہی ہے۔ اس میں نہ کھائی ہے، نہ کٹیلے تار ہیں اور نہ کسی محکمہ کے چوکی دار۔ لیکن لمبے چوڑے گوچر میں ایک بھی پتی، ایک بھی ٹہنی کی چوری نہیں ہوتی۔ وقت وقت پر گوچر اور ان کی حد بندی پر ''کار'' لگائی جاتی ہے۔ ''کار'' منتروں اور پوجا سے پاک کیے گئے دودھ، گوموتر اور گنگا جل کا مکچر ہوتا ہے۔ اسے ایک ایسے دھات کے پاتر میں، گھڑے میں ڈالا جاتا ہے جس میں نیچے ایک چھوٹا سا چھید ہوتا ہے۔ پاتر کا منھ دو طرف جھولنے والی رسی سے باندھ کر دو لوگ اسے اٹھاتے ہیں اور تیزی سے چلتے ہیں۔ اس طرح گوچر کی پوری حد بندی پر ''کار'' سے لائن کھینچی جاتی ہے۔ پیچھے پورا گاؤں چلتا ہے۔ مٹی میں گرنے والی دودھ اور گنگا جل کی یہ باریک لائن کچھ ہی پل بعد سوکھ جاتی ہے۔ لیکن پورے گاؤں کے دل پر یہ اپنی امٹ چھاپ چھوڑ جاتی ہے۔ ''کار'' لگنے کے بعد سب لوگ زمین سے مٹ چکی لیکن من میں کھنچ گئی اس امٹ لائن کو مانتے ہیں۔ گُراڈ میں آج سوکھا اور گرا پڑا پیڑ بھی

ے چھپ پر ساد با مھتالاپوڑیا کوئی باہر نہیں لاتا، پیڑ کاٹنے کی تو بات ہی چھوڑیے۔

لیکن گُراڈ جیسے نمونے آس پاس کے دیگر گاؤں میں اب نہیں دکھتے۔ ایک وقت رہا ہوگا، جب اس طرح کے کام کئی گاؤں میں رہے ہونگے۔ شاید سبھی گاؤں میں۔

کوئی بھی اچھا کام سوکھ چکے سماج میں امید کی تھوڑی نمی بکھیرتا ہے اور پھر نئی جڑیں جمتی ہیں۔ نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ گرام وکاس نویوک منڈل لاپوڑیا کی خزانہشوں سے گوچر کو سدھارنے کا یہ کام اب دھیرے دھیرے آس پاس کے گاؤں میں بھی پھیل چلا ہے۔ گاگرڈو، ڈوریا، سیتا پور، نگر، سہل ساگر، مہت گاؤں، گنیش پورہ وغیرہ کئی گاؤں میں آج چوکا طریقہ سے گوچر کو سدھارنے کا کام بڑھ رہا ہے۔ سب جگہ ایسے کام کی ضرورت ہے، لیکن ایسے کام کے پیچھے جیسی تنظیم جیسا صبر چاہیے اگر ویسا نہ ہوتو یہ کام کھڑا نہیں ہو پاتا۔ آج کوئی اسّی گاؤں میں یہ کام بڑھ رہا ہے۔ ان میں سے کوئی پندرہ گاؤں میں یہ کافی آگے جا سکا ہے۔

کامیابی کا راض:

کچھ گاؤں لاپوڑیا کے گوچر ترقی کے کام کو خود دیکھنے آئے تو کچھ جگہ لاپوڑیا کے لوگ خود گئے۔ تجربے لیے دیئے گئے اور اس طرح یہ کام دھیرے دھیرے دیگر گاؤں میں پھیل رہا ہے۔ لیکن صرف چوکا بنانے بھر سے گوچر نہیں سنبھل پاتا۔ اس کی کامیابی کا راض سماج کی ایکتا میں چھپا ہوا ہے۔ خودغرضی سے اوپر اٹھے بنا ایسی تنظیم بن نہیں پاتی۔

ایک گاؤں میں جب گوچر پر کام شروع ہوا تو وہاں کے تھوڑے سے لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ ان لوگوں نے سیاست اور ذات دونوں کا کھل کر استعمال کیا۔ منسٹر سے لیکر نیچے تک کے آفیسروں کو فون کروایا کہ کچھ غنڈے گوچر پر قبضہ کرنے کے لیے گوچر ترقی کا تعصبی کام لیکر آئے ہیں۔ پھر یہ معاملہ عدالت تک بھی گیا۔ لیکن آخر میں لوک سنگٹھن کام آیا۔ اس کی نیتک طاقت کے آگے یہ لوگ جھک گئے۔ جن کی جیت ہوئی وہ ہارے ہوئے لوگوں کے سامنے اور زیادہ جھک گئے۔ اس نرمی نے ہار جیت کا فرق مٹا دیا۔ ایسے واقعہ یہ بھی

بتاتے ہیں کہ گاؤں کو سدھارنے کی پلاننگ میں سرکار کو بالکل کسی کی طرفداری نہ کر کام کرنا چاہیے۔ الزام سامنے آئیں تو صبر کے ساتھ ان کی جانچ کی جانی چاہیے اور گوچر جیسے معاملوں میں اپنی قانونی ذمہ داری ذات اور سیاست سے اوپر اٹھ کر نبھانی چاہیے۔

صرف یہاں ہی نہیں، پورے ملک میں گوچر کے ساتھ اچھی مانی گئی سرکاروں نے بھی کئی طرح کی گڑبڑیاں کی ہیں۔ ووٹ کی سیاست گاؤں کے بغیر زمین اور دلت کا سوال اٹھا کر گوچر کی زمین کھیتی کے لیے بانٹکر واہ واہی لوٹتی ہے۔ ملک کی لیڈری کو بھی سمجھنا چاہیے کہ کمزور مانے گئے حصے کے پاس جو بکریاں ہیں، جو جانور ہیں آخر وہ کہاں چرنے جائیں گے؟ لاپوڑیا اور اس کے آس پاس کے گاؤں کا یہ پکا تجربہ ہے کہ گوچر ترقی کا فائدہ ایسے پریواروں کو بھی بھرپور ملتا ہے۔ اسی لیے دھیرے دھیرے اب اکاؤنٹ آفیسر بھی اس ایریہ میں گاؤں کی ترقی کی پلاننگ میں گوچر پر بھی دھیان دینے لگے ہیں۔

اکاؤنٹ بورڈ کے چیئرمین اور گاؤں کی ترقی کے سکریٹری سے لیکر کئی ضلعوں کے کلکٹر، تحصیلدار، بی.ڈی.او. اب لاپوڑیا کے کام کو مثالی کام مان کر یہاں سیکھنے آتے ہیں۔ اور پھر اپنے ایروں میں سرکاری کئی طرح کی پلاننگ کے ذریعہ سے اس کام کو اٹھا رہے ہیں۔ لاپوڑیا کے اس کام کا اثر اب اونچے درجہ پر بننے والی نیتیوں پر بھی کچھ حد تک پڑنے لگا ہے۔ اسے سوکھے راحت میں بھی شامل کیا جا رہا ہے۔ اب سوبعی سرکار نے اسے غریبی مٹانے والے کام سے جوڑا ہے۔

لاپوڑیا کے اس کامیاب ایکسپیریمنٹ نے کچھ اور باتوں کی طرف بھی دھیان کھینچا ہے۔ ۱۹۹۸ء کے بعد سے ملک کے کوئی آدھے حصہ میں سوکھا پڑتا رہا ہے۔ کئی حصّوں میں اوسط سے آدھی اور کہیں کہیں اس سے بھی کم برسات ہوئی ہے۔ اس خطرناک حالات سے نپٹنے کے لیے کئی تنظیموں نے اور پھر ان کے اثر سے سرکاروں نے بھی برسات کا پانی اکٹھا کرنے کے لیے طرح طرح کی پلاننگ کی ہیں اور انہیں پورا کرنے کے لیے قدم اٹھائیں ہیں۔ گاؤں کے ایریوں میں پرانے تالابوں کو ٹھیک کرنے اور نئے تالاب بنانے کی طرف دھیان گیا ہے۔

گوچر اور قحط کا حل:

لیکن گوچر ترقی کا یہ کام بتاتا ہے کہ تالابوں میں تو پانی روکنا ہی چاہیے، ساتھ ساتھ اسی مقصد کو اور آگے بڑھانے کے لیے گوچر کی طرف بھی دھیان دینا چاہیے۔ یہ کام دو طرح سے گاؤں کو سوکھے سے لڑنے کے لیے مضبوط بناتا ہے۔ گاؤں میں گوچر کا ایریہ اکثر تالاب کے بھراؤ سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں

برسات کے ایک موسم میں ۹۔۸ انچ پانی ایک بڑے حصہ میں تیزی سے بہہ کر برباد جانے کے بدلے چوکا طریقہ سے ایک کونے سے دوسرے کونے تک دھیرے دھیرے زمین میں سماتا جاتا ہے۔ اس طرح یہ زمین کے اندر کے پانی کو اٹھاتا ہے۔ سوکھی زمین کا پیٹ بھرتا ہے، اس کی پیاس بجھاتا ہے اور پھر اچھی نمی کی وجہ سے گوچر میں گھاس کی جازم بچھاتا ہے۔ اس سے گاؤں کے پاس سوکھے سے لڑنے کے لیے پانی بھی رہتا ہے اور جانوروں کے لیے ضرورت کے مطابق گھاس بھی۔

آج لاپوڑیا گاؤں میں کوئی ۲۰۰ گھروں کے بیچ بستی اور ان کے کھیتوں میں ۱۰۳ کنویں ہیں۔ چھ سال کے سوکھے کے بعد بھی آج ان میں سے ہر کنویں میں کافی تعداد میں پانی مہیہ ہے۔ اس چھپے خزانے کا استعمال لاپوڑیا گاؤں فصل اگانے کے علاوہ اپنے جانوروں کے لیے ہرا چارا پیدا کرنے کے کام میں بھی لگا رہا ہے۔ سوکھے کے جن دنوں میں آس پاس کے دوسرے گاؤں میں باہر سے سوکھا چارا لانا پڑا ہے یا اپنے جانوروں کو راحت کیمپ میں بھیجنا پڑا ہے، وہیں لاپوڑیا کو تقریباً ہر گھر اپنے کھیت کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر، آدھا بیگھا، ایک بیگھا پر اپنے جانوروں کے لیے ہرا چارا اگاتا ہے۔ کھیت کے اس ٹکڑے کی حفاظت کے لیے کوئی چار پانچ فٹ اونچی مٹی کی ایک دیوار بھی بنائی جاتی ہے۔ اس چارے کو اگانے کے لیے پانی ان کے کنویں سے آتا ہے۔ عام کھیتوں میں سوکھے کے بیچ کھڑی فصل کا ہرا رنگ دیکھ کر جو اچرج ہوتا ہے، اسی کھیت کے ساتھ مٹی کے قلع نما ٹکڑے میں دوگنے گہرے ہرے رنگ کا چارا دیکھ کر وہ اچرج بالکل چوگنا ہو جاتا ہے۔

اپنے گوچر اور تالاب میں محنت کا پسینہ بہا کر جو پانی روکا گیا ہے، اس نے لاپوڑیا کو بہت حد تک ہرا بنا دیا ہے۔ اب اس ہریالی کا رنگ لوگوں کے من پر بھی دکھنے لگا ہے۔ اب انہیں لگتا ہے کہ انہوں نے لاپوڑیا میں ان سب کاموں کو کرنے کے لیے کچھ سال پہلے جو جدّ و جہد کی تھی، جو آندولن چلایا تھا وہی سب دوسرے گاؤں میں کرنا ضروری ہے۔ گاؤں کے من کو ہرا بنانے کا کام خوشی اور مدد کی نیو پر کھڑا ہونا چاہیے۔ آج لاپوڑیا کے لوگ گوچر کی روایت کے بارے میں پرانی بھول چکی باتوں کو طرح طرح سے اکٹھا کر رہے ہیں، پرانے قانون اور قاعدہ سمجھ رہے ہیں۔ ان میں سے کیا دوبارہ اپنانے لائق ہے، اس پر غور کر رہے ہیں۔

گوھدہ : بیحد کڑا ادب :

گوچر لفظ گائے کو، گونسل کو بیچ میں رکھ کر بنا ہے۔ لیکن گوچر میں گائے بیل کے علاوہ اونٹ، بھیڑ اور بکری بھی چرنے آسکتی ہیں۔ پابندی اگر ہے تو صرف پڑوسی گاؤں کے جانوروں کے لیے۔ اس کی سیدھی سی وجہ صرف یہی ہے کہ پڑوسی گاؤں کو بھی محنت کر اپنا گوچر اتنا اچھا بنا لینا چاہیے کہ ان کے جانورں کو دوسرے گوچر

میں جانے کی ضرورت نہ پڑے۔ ایک گاؤں کے جانور اپنے گوچر کی حد سے باہر چرنے کے لیے دوسرے گوچر میں نہیں جاسکتے۔ اس کا سب سے بڑا نمونہ راجستھان کے بھرتپور ایریہ میں ملتا ہے۔ اس ایریہ میں ایک جگہ کا نام گوہد ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ یہاں تک شری کرشن اپنی گائیں چرانے آسکتے تھے۔ لیکن اس کے بعد ان کی حد، باؤنڈری ختم ہو جاتی تھی۔ ہمارے گاؤں نے جانور پالنے کا جو مضبوط ڈھانچہ کھڑا کیا تھا، اس میں تین دنیا کے مالک بھگوان شری کرشن کے لیے بھی اتنے ہی کڑے قاعدے لاگو کیے تھے، جتنے کہ عام جانور پالنے والوں کے لیے ہوتے تھے۔

گوچر کے استعمال کا یہ مضبوط ڈھانچہ اپنے گاؤں، پڑوسی گاؤں اور دور کے گاؤں کی بھی ضرورتوں کو دھیان میں رکھ کر بنایا گیا تھا۔ باہر کے جانوروں کا جھنڈ گاؤں کے گوچر سے گزر سکتا تھا، ان پر روک نہیں تھی۔ لیکن وہ چھوٹے سے گاؤں کو چھوٹے سے گوچر کو پوری طرح سے نہ اجاڑیں۔ اس کی احتیاط کی جاتی تھی۔ وہ گوچر سے گزر سکتے تھے، چر سکتے تھے۔ کھیلی میں پانی پی سکتے تھے، لیکن لمبے وقت تک چرنے کے لیے اسی گاؤں کے کھیتوں میں کسان کے ساتھ مرضی کی بنیاد پر بٹھائے جاتے تھے۔ اس بٹھائی کا مطلب تھا کہ کھیتوں میں فصل کٹائی کے بعد بچے ڈنٹھل، یہ جانور چر سکتے ہیں۔ کھیتوں میں ان کی موجودگی سے زمین کو مینگنی، گوبر اور پیشاب سے قیمتی کھاد ملتی تھی۔

ملک کے بہت بڑے حصہ میں جانور پالنے والے خاص کر بھیڑ پالنے والے اپنے بڑے بڑے جھنڈوں کو لیکر الگ موسم میں الگ الگ راستوں سے گھومتے رہتے ہیں۔ بھیڑوں کے ان بڑے ریوڑوں کی آواجاہی کا پورا نقشہ فصلوں کی کٹائی کے کلینڈر سے جوڑ کر رکھا گیا تھا۔ سینکڑوں، ہزاروں بھیڑوں کے جھنڈ ایک جگہ کا چارا ختم ہونے پر اس طرح دوسرے مقامات میں پہنچتے تھے اور ان خالی کھیتوں میں بیٹھ کر انہیں اپنے گوبر پیشاب سے خوبصورت کھاد دیتے تھے۔

کسان اور بھیڑ پالک کے بیچ کا یہ برابر کا رشتہ اب نئی فصلوں اور نئے کلینڈر کی وجہ سے ٹوٹ چکا

ہے۔اوراسی کے مطابق ان دونوں فرقوں کے بیچ خطرناک کشیدگی بھی دیکھنے میں آرہی ہے۔مدھیہ پردیش اورراجستھان کی لائن پر ہرسال ان میں تناسب بھی ہونے لگا ہے۔اب یہ دکھدائی حالات دھیرے دھیرے راجستھان کے مقامات پربھی آنے لگے ہے۔

لاپوڑیا کا گوچر محفوظ رکھنے کا آندولن اوراب اس کا دوسرے گاؤں میں بڑھاوا ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ باہری دشمن سے لڑنا عام طور پرکم مشکل کام ہے۔لیکن جب لڑائی اپنوں سے،اپنے ہی گاؤں کے لوگوں سے ہو،اپنے رشتہ داروں سے ہوتو کچھ دوسرے ہی طرح کا امتحان سامنے ہوتا ہے۔اس میں تناسب کی شکل کو، مخالفت کو نارے،دھرنہ،جلوس سے اوپر اٹھنا پڑتا ہے۔اپنے کوسدھارتے ہوئے گاؤں کوسدھارنا ہوتا ہے۔ سب کو مالک بناتے ہوئے ان میں خادم کی ذہنیت بھی آسکے۔اگرایسا کرنا ہوتو تناسب پھیلانے والوں کوبھی خادم کے کردار میں آنا ہوتا ہے۔

آج لاپوڑیا میں کئی کسان گاؤں کے اٹھے ہوئے پانی کی سطح کی وجہ سے ایک بیگھا،دو بیگھا میں ہرا چارا لے رہے ہیں۔یہ کوئی چھوٹی مدت کی فصل نہیں ہے۔سال بھر،بارہ مہینے یعنی تین سو پینسٹھ دن تقریباً ایک من چارا روز نکالنا اپنے آپ میں ایک بڑا اعزاز ہے۔وہ بھی اس گاؤں میں جہاں سوکھا کا چھٹواں سال بیٹھا ہو۔

ترکش کے کئی تیر :

کسان جانور پالنے میں کئی باتوں کا دھیان رکھتے ہیں۔جس طرح سے ہم لوگ ایک سا کھانا کھاتے کھاتے تنگ آسکتے ہیں،اسی طرح جانور بھی ہیں۔انہیں سال بھر الگ الگ ڈھنگ سے چارا دینے کا پورا کلینڈر گاؤں سماج نے انتظامی شکل سے بنایا تھا۔گوچر اور چویلی اور بیڑ کے علاوہ کسانوں کے اپنے گھروں میں، باڑوں میں ''بھکھارا'' اور ''بھریاں'' بنایا جاتا رہا ہے۔ بھکھارا کوئی سات آٹھ ہاتھ چوڑا اتنا ہی اونچا اور ۵۰۔۷۰

ہاتھ لمبا ایک کچا ڈھانچہ ہوتا ہے۔اس میں تیس چالیس ٹرالی چارا سال بھر کے لیے جمع رکھا جاتا ہے۔ایک ٹرالی میں کوئی ۷۰ من آتا ہے۔بھکھارا میں کٹا ہوا چارا جمع کیا جاتا ہے۔یہ گوار، باجرا، جوار اور گیہو کی فصلوں کے ڈنٹھل اور بھوسے سے بنتا ہے۔اس ڈھانچہ میں لمبائی والے حصہ میں کھڑکی نما دو جھروکھے ہوتے ہیں، جنہیں کھولکر ضرورت کے مطابق چارا نکالا جاتا ہے۔باقی چارا پورے سال بھر محفوظ رکھا رہتا ہے۔بھریاں میں ساب چارا اکٹھا کیا جاتا ہے۔اس کا قد کوئی ۲۵ فٹ اونچا اور ۱۵ فٹ چوڑا بھونرے نما ہوتا ہے۔اس میں کٹی فصل کے ڈنٹھل اس خاص ڈھنگ سے جمائے جاتے ہیں کہ بالکل کھلے آسمان کے نیچے رکھے رہنے کے بعد بھی یہ چارا بھیگتا نہیں، سڑتا نہیں۔اوپر سے لیکر نیچے تک کی چنائی اسی چارے سے ہوتی ہے۔پھر بھی ایک بوند پانی اندر نہیں جاتا ہے۔اس انتظام کے ذریعہ سے جانوروں کو پورے سال بھر تک عام جگہوں کے علاوہ گھر سے بھی صحتیابی خوراک ملتی رہتی ہے۔

اوپر بتائے گئے ڈھانچوں کے علاوہ ایک اور ڈھانچہ بنایا جاتا تھا۔اس کا نام تھا ''باگر''۔یہ ڈھانچہ آزادی سے پہلے تک چلن میں تھا۔پھر ٹھکانیداری، ریاستوں کے راج جانے کے بعد یہ بھی چلن سے ہٹ گیا۔

باگر کی حفاظت کے لیے باڑ لگائی جاتی تھی۔اس میں کوئی پچیس ہاتھ چوڑا چالیس ہاتھ لمبا اور ۱۵ ہاتھ اونچا گھاس کا ڈھیر ہوتا تھا۔اس لیے اسے گاؤں کی خاص آبادی سے تھوڑا ہٹ کر بنایا جاتا تھا۔کبھی آگ وغیرہ کا حادثہ ہو ہی جائے تو بستی پر اس کا برا اثر نہ پڑے۔اس انتظام میں بھی کوئی رکھوالا نہیں ہوتا تھا اور یہ بھی کسی کی ذاتی دولت نہیں مانی جاتی تھی۔پورا گاؤں چلتے پھرتے اس کی رکھوالی کرتا تھا۔

باگر ایک طرح کا چارا بینک، خزانہ ہوتا تھا جو مشکل کے وقت میں کھل جاتا تھا۔تب اس میں سے جو جتنا چارا لیتا، اتنا ہی چارا اچھی فصل آنے پر اس خزانہ میں واپس بھر دیتا تھا۔باگر کے خزانہ سے چارا دیتے وقت ترازو کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔یہ گاؤں کے اپنے انتظامات تھے۔اور اپنے لوگوں کے لیے تھے۔پھر بھی چارا لیتے اور دیتے وقت ایک موٹا حساب رکھا جاتا تھا۔اس کے لیے پگڑی کا استعمال ہوتا تھا۔ہر پریوار سات ہاتھ کا بنڈل پگڑی میں بندھ جائے اتنا چارا دیا جاتا تھا۔اور ایسے ہی سات ہاتھ کی پگڑی میں جتنا بنڈل بندھتا ہے، اتنا واپس ہو جاتا تھا۔سوکھے سے لڑنے کے لیے گاؤں کے اس انتظام میں ترکش میں کئی تیر ہوتے تھے۔جیسے چارے کا انتظام تھا، اسی طرح مشکل وقت کو پار کرنے کے لیے اناج کا زخیرہ بھی جمع کیا جاتا تھا۔اس کے لیے کھائی نام کا ایک ڈھانچہ بنایا جاتا تھا۔یہ انتظامات بھی ریاست کے بعد پوری طرح ٹوٹ چکے ہیں۔

اکال پاٹتی تھی کھائی :

کھائی ایک طرح کا سوکھا کنواں ہوتا تھا۔ اس میں اناج کا خزانہ محفوظ رکھا جاتا تھا۔ ہر ایک کھائی کوئی ۱۰ سے ۱۵ ہاتھ گہری اور ۷ ہاتھ کی گولائی لیے ہوتی تھی۔ یہ گولائی نیچے سے اوپر آتے وقت تھوڑی کم ہو جاتی تھی۔ پورا اناج بھر جانے پر اسے مٹی کے گھول سے ڈھکن بنا کر بند کر دیا جاتا تھا۔ سبھی کھائیاں تھوڑی اونچی جگہوں پر بنائی جاتی تھیں، تاکہ برسات کی نمی اور پانی ان میں نہ جا پائے۔ کھائی کے اندر بہت احتیاط سے گوبر اور مٹی سے لپائی کی جاتی تھی۔ اس میں کچھ حصہ راکھ کا بھی ہوتا تھا تاکہ اناج میں کیڑے نہ لگیں۔

لاپوڑیا گاؤں میں آزادی سے پہلے تک بیس کھائیاں تھیں۔ اچھی فصل آنے پر ہر گھر سے اس میں ایک طے شدہ تعداد میں اناج ڈال کر بند کر دیا جاتا تھا۔ جب تک گاؤں کی سبھی کھائیاں بھر نہیں جاتی تھیں، تب تک گاؤں سے ایک دانا بھی باہر بیچا نہیں جا سکتا تھا۔ ان کھائیوں میں تین سال تک اناج محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اگر اس مدت میں سوکھا نہیں پڑے تو کھائی کھول کر اس کا اناج واپس کسانوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ اگر سوکھا آ ہی گیا تو یہ کھائیاں اس خطرہ کو سہنے کے لیے کھول دی جاتی تھیں۔ سوکھے کا خطرہ ہونے پر کھائی کھولنے کا فیصلہ گاؤں کے دو پٹیل اور ٹھکانے دار کی ایک چھوٹی سی بیٹھک میں فی الفور لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد گاؤں کے گھروں کی ضرورت دیکھتے ہوئے ایک کے بعد ایک کھائی کھلتی جاتی تھی اور اناج تقسیم ہوتا جاتا تھا۔ ایک موٹے حساب سے ہر پریوار ہر مہینہ کوئی ایک من اناج بانٹا جاتا تھا۔ سوکھا ختم ہونے پر، اچھی پیداوار آنے پر انہیں پریواروں سے چالیس کلو کے بدلے پچاس کلو اناج واپس لیکر پھر سے کھائی میں محفوظ رکھ دیا جاتا تھا۔

گاؤں کی بیس کھائیوں میں سے صرف چار کھائی ٹھکانیدار کے گڑھ کے اندر تھیں۔ باقی ۱۶ / گاؤں کے عام جگہوں پر بنی تھیں۔ ان ۱۶ / کھائیوں کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے سامنے پڑنے والے گھروں کی ہوتی تھی۔ یہ پریوار بھی سبھی ذاتوں کے اور سبھی طرح کی معاشی حالات کے ہوتے تھے۔ ایک کھائی مندر کے سامنے تھی اور اس کی رکھوالی پروہت خود کرتے تھے۔ بھگوان کی پوجا میں بھکتوں کی پوجا، گاؤں کی پوجا بھی شامل رہتی تھی۔ گڑھ کے اندر چار کھائی اس لیے رکھی جاتی تھیں کہ کہیں کسی حملہ میں گاؤں کی کھائیوں میں آگ لگا دی جائے تو کم سے کم گڑھ کی چار کھائی محفوظ رہ سکیں گی۔ آج بھارتیہ کھادیہ نگم جیسے انتظامات گاؤں کا اناج گاؤں سے باہر نکالکر کہیں دور شہروں میں جمع کرتا ہے اور خطرہ کے وقت اسے ٹھیک وقت پر گاؤں میں واپس نہیں کر پاتا۔ کھائی اناج کی حفاظت کا بہتر انتظام تھا۔

گوچر کا پرشاد:

آج ۲۰۰ رگھروں کا چھوٹا سا لاپوڑیا گاؤں جانور پالنے اور کسانی کے بیچ ٹوٹ چکے ان رشتوں کو جوڑنے کا ایک بڑا کام کر رہا ہے۔ ۶ رسال کے سوکھے کے بعد آج اس گاؤں میں دودھ خوب ہو رہا ہے۔ اس میں بھی تناسب بنا کر رکھا گیا ہے۔ اپنے گھر کی ضرورت کا دودھ بچا لیا جاتا ہے۔ باقی جیپور کی ڈیری کو دیا جاتا ہے۔ سوکھے کے بعد بھی لاپوڑیا میں جمع ہونے والا دودھ ڈیری کی دیگر جگہوں سے زیادہ ہے اور کوالٹی بھی اچھی ہے۔ لاپوڑیا کے پاس خالص چارا ہے۔ یہاں جوار، باجرہ، گوار اور ہرے چارے کی پیداوار میں کسی بھی طرح کی کیمیادی کھاد اور کیٹ ناشک بالکل نہیں ڈالا جاتا۔ اس لیے آج خالص دودھ ہے، اچھی فصل ہے اور اس سال ۲۰۰۰ء میں تقریباً ہر گھر کے پاس بھریاں ہیں۔ کچھ کے پاس ایک سے بھی زیادہ۔ ان بھریوں میں فصل کٹائی کے بعد بچے ڈنٹھل چارے کی طرح اکٹھا کیے جاتے ہیں اور ان کا استعمال اگلے کسی بھی خطرے کے دور میں ہوتا ہے۔

لاپوڑیا نے تالابوں کے ساتھ ساتھ اپنا گوچر بھی بچایا ہے اور ان دونوں نے مل کر یعنی تالاب اور گوچر نے لاپوڑیا کو بچا لیا ہے۔ آج گاؤں کی پیاس بجھ چکی ہے۔ چھ سال کے سوکھے کے بعد بھی یہاں مطمئن زمین میں چاروں طرف ہریالی ہے۔ کوئل کی گونج ہے تو عام سی مانی جانے والی چڑیوں کی خاص چہچہاہٹ ہے۔

لاپوڑیا گاؤں میں کسی بھی سڑک، گلی یا چوراہے کا نام کسی لیڈر کے نام پر نہیں ملے گا۔ گاؤں میں کہیں بھی گاندھی جی کی مورتی نہیں ہے۔ لیکن آج پورا گاؤں گاندھی جی کے اصولوں کی مکمل شکل بننے کی خواہش کر رہا ہے۔ گاؤں کے پرانے جھگڑے آپسی بات چیت سے ختم ہو چکے ہیں۔ پولس اور کچہری کے چکر لگانے کے بدلے اب لاپوڑیا کے لوگ سال بھر آنے والے تہواروں میں مل کر ناچتے گاتے ہیں، گلال اڑاتے ہیں۔ شہنائی اور ڈھول نگاڑوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ خوشی کی اس برسات کے بیچ میں آپ کسی بھی دن پائیں گے کہ گاؤں کے بزرگ۔ رام کرن دادا، کالو دادا، رام کرن ماما اور ان کے ساتھ اگلی نسل کے نوجوان لڑکے لڑکیاں آس پاس اور دور کے گاؤں میں نکل گئے ہیں، تاکہ وہاں بھی کائنات کے اس عبادت کا کام شروع ہو سکے۔ اور وہاں بھی لاپوڑیا کی طرح تالاب، گوچر کا پرشاد خوشی سے بٹ سکے۔ لاپوڑیا میں اچھے خیالوں سے اچھے کاموں کی شروعات ہو چکی ہے۔

نمک ستیہ گرہ کے بعد پانی ستیہ گرہ کی ضرورت

دھروشکل

سب کی ضرورت کی چیز نمک پر جب فرنگیوں نے ٹیکس لگایا تو مہاتما گاندھی نمک قانون توڑنے داانڈی کوچ پر نکل پڑے تھے۔ وہ غلامی کے دن تھے جب باپو کی رہنمائی میں ہمارے بزرگ سینانیوں کو سمندر کنارے تک جانے کے لیے لمبا سفر کرنا پڑا تھا۔ آزاد ہندوستان میں اب ایک ضروری ستیہ گرہ کی ضرورت آپڑی ہے، جس کے لیے اپنے گھر سے کہیں دور نہیں جانا ہے، بلکہ اپنے ہی پڑوس، گاؤں اور شہر میں پانی کی طرف سے کھڑے ہو کر ستیہ گرہی ہوا جا سکتا ہے۔

جو جہاں رہتا ہے وہ اس بات کا پتہ لگا سکتا ہے کہ ہمارے پرکھوں نے جو کنوے کھودے تھے وہ آج کس حال میں ہیں۔ وہ دھنس گئے ہوں، اس کی جگت ٹوٹ رہی ہو یا ملبے اور کچرے سے پر کر ان کی جھریں اوجھل ہوتی جا رہی ہوں۔ جو تالاب ہمارے بزرگوں نے سالوں محنت کر کے بنائے ہو نگے، کہیں وہ اتھلے تو نہیں ہو گئے ہیں۔ کہیں ہماری ہی بہائی گندگی انہیں بدبودار تو نہیں بنا رہی ہے۔ کئی گاؤں میں کچھ قدرتی جھریاں، نال اور چھوٹی نہریں بہا کرتی ہیں، ان میں سے کچھ بارہ مہینہ بھی ہوتی ہیں، کچھ کا پانی گرمی کے موسم میں کم ہونے لگتا ہے۔ برسات آنے پر وہ پھر کھل اٹھتے ہیں۔ اس پانی کے ذرائع کی پہچان، جو جہاں ہے وہیں رہ کر کر سکتا ہے۔ کہیں کہیں پرانی باؤڑیاں ابھی بھی ہیں جو اپنی گہرائی میں پانی کو بچائے ہوئے ہیں۔ ان اکیلی پڑ گئی بھتبا ہوتی جا رہی باؤڑیوں میں کبھی جھانک کر ہی دیکھ آئیں، شاید یہ پھر ہمارے کام آسکیں۔

نئے کنوے تو ضرورت کے مطابق بنتے ہی رہتے ہیں۔ اور انہیں کھودنے والے کئی مرتبہ ناکام بھی ہوتے ہیں کیوں کہ اب زمین میں پانی کافی نیچے چلا گیا ہے۔ نئے تالاب بھی اپنی گہرائی کو پوری طرح پانی سے بھر نہیں پاتے۔ کیوں کہ نئے زمانے کے بہت سے چالاک لوگ پانی کے بہاؤ کی سمت کی ٹھیک معلومات بھی کہاں رکھتے ہیں۔ کہیں بھی گڈھا کھود لینے سے تالاب نہیں بن جاتا۔ ہمارے بزرگوں نے گاؤں اور شہروں میں پانی کی جو جگہیں طے کی تھیں وہ آج بھی کامیاب ہیں۔ اگر وہاں ذرائع سوکھ گئے ہیں تو سب سے پہلے ہم

انہیں ہی زندہ کیوں نہ کر لیں جو سب کی زندگی کی بنیاد ہے۔ اسے تو سب کو مل کر ہی بچانا ہوگا، کیوں کہ دنیا میں کچھ مٹھی بھر لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں پانی کو بچانے کی اتنی فکر نہیں، جتنی بچے ہوئے پانی کو بیچ کر پیسہ کمانے کی ہے۔ ندیوں کو جوڑنے کی جو بات آج کل چلائی جا رہی ہے اس پر اگر گہرائی سے سوچیں تو وہ دنیا میں پانی پر خود کا قبضہ کرنے کی ایک سوچی سمجھی چال لگتی ہے جو زمین پر ریت اور دل دل کو بڑھائے گی۔ بن بلائی باڑھیں پیدا کرے گی۔ اور کسی ایک طاقتور کی طرف پانی کے بہاؤ کو موڑ دیگی۔ پانی سب کی ضرورت ہے اس کا دل چاہا استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بہت بیدار ہو کر پانی کے ساتھ اپنے رشتہ پر گہرائی سے سوچنے کا وقت ہے۔ پچھلے پچاس سالوں میں ہمارے محنتی کسانوں نے دوسروں کے کہنے میں آکر کچھ ایسے کھاد اور بیج اپنائے جن کی فصلیں زیادہ پانی مانگتی ہیں۔ اس وجہ سے جدید طریقوں سے زمین کے اندر بھرا اجلا پانی جلدی جلدی الیچا گیا۔ زیادہ فائدہ کمانے کی چاہت میں پانی کا قتل کیا جاتا رہا۔ یہ بیہودہ کام آج بھی جاری ہے۔ گاندھی جی کہتے تھے کہ کسان تو ہماری زمین کا نمک ہیں۔ اب ہمیں اس سے بھی جا کر اپنے عزت دار کسانوں سے کہنا چاہیے کہ آپ تو زمین کا پانی بھی ہیں آپ کے پسینے کی بوندوں سے ہی مٹی میں نمک کا ذائقہ ہے اور پانی بھی ہے۔ ہمارے بزرگ کسان کبھی نمک کے لیے باپو کے پیچھے چل پڑے تھے۔ اب پانی ستیہ گرہ کے لیے انہیں خود آگے آنا ہوگا۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ سب لوگ پانی ستیہ گرہ کرتے ہوئے اپنا پانی ساتھ لیکر چلنے کی عادت ڈال لیں۔ بات بات میں عہد کا پانی اپنی انجلی میں اٹھانے والے ملک کے لوگ اپنا پانی ساتھ لیکر کیوں نہیں چل سکتے۔ پر وہ پانی نہیں جو بوتلوں میں بکتا ہے بلکہ وہ پانی جسے ہم اپنے گھر سے لیکر ہی سفر پر نکلیں۔ آنکھوں کا پانی مرنے لگے تو بازار سے پانی خرید کر آنکھیں نہیں بھری جا سکتیں بلکہ اپنے ہی اندر جگت کے لیے درد کا وہ ذریعہ کھوجنا ہوگا جس کی وجہ سے سب کی آنکھیں چھلک آتی ہیں۔ یہی وہ ذریعہ ہے، جس سے کنوئے بھر سکتے ہیں،

تالاب سوکھنے سے بچائے جاسکتے ہیں۔ساری ندیاں لگاتار بہتی رہ سکتی ہیں۔

ستیہ گرہ کرتے پانی کی آواز سنو

بوندوں کو دیکھو تو لگتا ہے کہ جیسے وہ پانی کے بیج ہوں۔ برسات زمین میں پانی ہی تو بوتی ہے۔ پہلے جھلے کے پانی کی ایک ایک بوند کو پیکر زمین کی گود ہریانے لگتی ہے۔جیسے ہر ایک بوند سے ایک انکر پھوٹ رہا ہے۔جیسے زمین پھر سے جی اٹھی ہو۔ برسات آتے ہی وہ پھولوں، پھلوں، جڑی بوٹیوں اور اناج کو اُگانے کے لیے بیچین دکھائی دیتی ہے۔کوئی زمین سے پوچھے کہ اسے سب سے زیادہ کس کی یاد آتی ہے تو وہ یقیناً کہیگی کہ پانی کی۔ وہ تو پانی سے اوپر اٹھکر ہی تو زمین بنی ہے۔وہ پانی کو کبھی نہیں بھولتی۔ وہ تو پانی کی یادوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔گرمی کے موسم میں جھلتی ہوئی زمین کو دیکھو تو لگتا ہے کہ وہ پانی کے وصل میں تپ رہی ہے۔اس سے دھیرے دھیرے دور ہوتا پانی اور اس کی گرم سانسیں ایک دن بدلی بن کر اس پر چھانے لگتی ہیں اور جھلسی ہوئی زمین کو سجانے کے لیے بادل پانی لیکر دوڑے چلے آتے ہیں۔

پانی کی آمد کا استقبال کرنے کے لیے کوی بھوانی پرشاد مشر ہمیں ایک کویتا لکھ کر دے گئے ہیں۔ پہلا پانی آتے ہی اس کویتا کی یاد آتی ہے پہلے جھل کا پانی جیسے آکاشوانی دنیا میں اس نے بھر دی ہو۔ ہر طرف جوانی۔ ہر ایک ادھ مرے کو بدلی نچا گئی رے، برسات آگئی رے۔ برسات آتے ہی چڑیا کی چہک کھل جاتی ہے۔وہ گھر کے آنگن میں دانا چگنے آتی ہیں۔ان کے پر ان کی نئی تازگی سے بھر اٹھتے ہیں۔سوکھے جھاڑوں پر نئی پتیاں جھلملانے لگتی ہیں۔نالوں، ندیوں اور جھرنوں کے سوکھے گیت پھر لوٹ آتے ہیں۔کسانوں کو کھیت بلاتے ہیں۔گھر کی چھپری میں آلہا کا گیت اور ڈھولک کی چھاپ گونجتی ہے۔جینے کے گیت کی سرگم پانی کے بنا پوری نہیں ہوتی۔موسیقی میں جیسے سات سُر ہوتے ہیں ایک سور سپتک ہوتا ہے۔ ویسے ہی پانی کے کئی سور سپتک ہیں۔جن میں پانی کے سور ڈوبے رہتے ہیں۔ جیسے جل ترنگ کے سات کٹورے ہوں، جن میں سے موسیقی کار

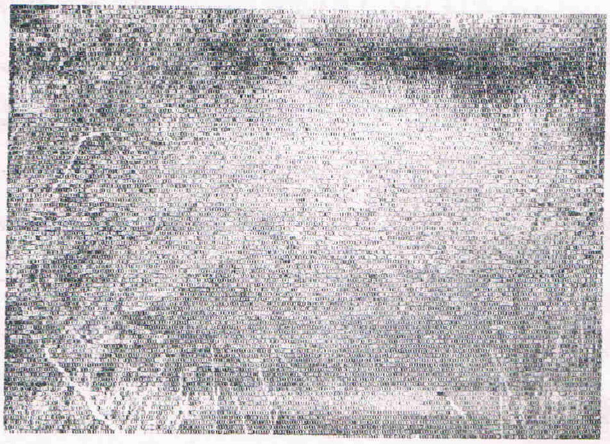

ایک ایک سور بڑے ہی سدھے ہاتھوں سے اٹھاتا ہے۔ایسے ہی پانی کے سپتک سرپور، سپتک اور سپت سمندر ہیں۔جس میں سے ایک آچمچ پانی اٹھانے پر پورے پانی کی آواز گونجتی ہے۔سورج کی ستر نگی کرنیں بھی تو ہولے ہولے زمین سے پانی کو اوپر اٹھاتی ہیں، اتنا ہی واپس کر دیتی ہیں۔ویدک رشیگن رچائیں گنگناتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب بادل برسات کرتے ہیں تو پانی نناد کرتے ہوئے بہتا ہے۔

پانی زندگی کا ستون ہے اور سب سے پرانا راستہ بھی وہی ہے، جو ہمیں نہ جانے کب سے کنارے لگاتا آرہا ہے۔ہم ہی اپنے لیے سوکھی گلیاں کھوجتے اور سڑکیں بناتے پانی سے دور آبسے ہیں۔پر پانی کہاں ہمارا پیچھا چھوڑنے والا ہے۔ہم بھلے ہی اپنا راستہ بھول جائیں، پانی تو اپنا راستہ جانتا ہی ہے۔اسے اچھی طرح یاد ہے کہ اسے کہاں بھرنا ہے۔بھلے ہی ہم نے اس کے کسی تالاب کو پور کر کالونی بنالی ہو پر وہ تو کہیں آکر بھریگا، ہمیں ڈبوئیگا۔کیوں کہ ہم نے پانی کی جگہ پر ناجائز قبضہ کرلیا ہے۔پانی ہمارے خلاف کسی عدالت میں نہیں جاتا وہ اس کے راستہ میں آگئی عدالت کو ضرور ڈبو دیتا ہے۔وہ ہر برسات میں ہمارے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ کہ میرے تالاب، میری قبھائی ندیوں کی جگہ خالی کرو۔مجھے اپنے آس پاس بسیرہ کرنے کی صاف ستھری جگہ دو۔اب پانی ان سب آدمیوں، کاروباریوں، انتظاموں کے خلاف آندولن پر ہے کہ میرے راستے سے ہٹو۔ میرا راستہ مت ہتھیاؤ، مجھے بنا رُکے بہنے دو۔کنیوں میں، پوکھر میں، تال میں بھرنے دو۔کنوؤں میں آہستہ آہستہ رسنے دو۔پہاڑوں سے خالی جھرنے دو۔مجھے باندھتے کیوں ہو۔کیوں میرے راستے موڑتے ہو۔مجھ میں اپنے گناہ دھونے والے تم کون ہوتے ہو۔میرے راستے میں گندی نالیوں کے منہ کیوں کھولتے ہو۔اپنی پوجا کے باسے پھول مجھ سے کیوں بہاتے ہو۔مجھ میں ڈوبو، تیرو، پار ہو جاؤ، پر مجھے مت ستاؤ۔آئے دن سڑکوں اور چوراہوں پر مطلبی قسم کے لوگ جب دھرنے دیتے ہیں تو ان کی طرف کوئی دیکھتا تک نہیں۔سب جان گئے ہیں کہ اس طرح کے لوگ ستیہ گرہی نہیں ہوتے ہیں۔وہ تو صرف اپنے لیے لڑتے ہیں۔پر پانی سے بڑا ستیہ گراہی کون ہوگا جو سب کے فائدے کے لیے اپنی راہ بہتا ہے۔اگر وہ آندولت ہے، ہمارے راستے روک رہا ہے، ہماری بستیاں ڈوبا رہا ہے تو ہمیں کچھ دیر ٹھٹھک کر پانی کی اس آواز کو سننا چاہیے۔

پانی تو زمین پر لکھی جاتی کویتا ہے

گوسوامی تلسی داس کہتے ہیں کہ وید پروان روپی اگادھیہ سمندروں سے سنت روپی بادل اٹھتے ہیں جو ہماری زندگی پر سُویش روپی، منگل کاری پانی کی برسات کرتے ہیں۔یہ پانی ہماری ہی سومتی کی زمین پر برستا ہے۔اور دل کی جھیل میں بال کانڈ سے اتر کانڈ تک جو سات سبق ہیں وہی اس مانس سروور کی سات خوبصورت

سیڑھیاں ہیں۔ یہ سیڑھیاں ہی ہمیں شری رام کی مہما کی گہرائی میں اتارتی ہیں۔ تلسی داس کہتے ہیں کہ اس رام کتھا میں جو تشبیہ دی گئی ہیں وہ ہی تو اس مانس سرورر کی ترنگیں ہیں۔ اس کی خوبصورت چوپائیاں پانی پر پھیلی کملنیوں جیسی ہیں۔ اس کے چھند سورٹھے اور دوہے مانس سرورر پر کھلے ہوئے کمل جھنڈوں جیسے ہیں۔ انوپم معنی اونچے بھاؤ اور سب کے دل کو چرانے والی زبان کا پراگ، مکرند اور خوشبو اس مانس سرورر کے چاروں اور پھیلی ہوئی ہے۔ اس رام چرت میں سور روپی کویتا کی کئی طرح کی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔

تلسی داس جی کہتے ہیں اس مانس سرورر کی رکھوالی وہی کر سکتے ہیں جن کی زندگی میں اہنسہ، اپری گرہ، برہمچریہ، سنتوش، سوادھیایہ اور تپ کے پھول کھلے ہوں اور ان پھولوں سے علم کے پھل بھی آئے ہوں۔ یہ پھول صرف کھل کر یوں ہی نہ جھر گئے ہوں۔ علم کا پھول آنے کے لیے اپنے صاف من کو مالی بنا کر صبر سے زندگی کے باغ کو اپنی ہی آنکھوں کے پانی سے سینچنا پڑتا ہے۔ اس مانس تال کی رکھوالی کرنا بڑا مشکل ہے کیوں کہ موہ، مد اور مان کے کئی بیہڑ جنگل ہمیں گھیرے ہوئے ہیں۔

تلسی بابا کہتے ہیں کہ اس مانس تال کی گہرائی کو صاف اور خوبصورت بنائے رکھنے کے لیے سچی عقیدت اور سنتوں کا ساتھ چاہیے کیوں کہ سنت سماج ہی دنیا میں چلتے پھرتے تیرتھ راج پریاگ کی مانند ہے اور یہ سنتوں کا سماج ہر ایک دیش کال میں سب کو آسانی سے ملتا رہتا ہے۔ دل کے سرورر سدا ہی ستسنگ سے صاف بنائے جاتے ہیں باہر کے سرورر کو بھی صاف رکھنے کے لیے ستسنگ چاہیے۔ زمین پر ندیوں اور سروورں کی بدحالی دیکھ کر لگتا ہے کہ ہمارا سادھو سماج ان کی طرف سے ذرا بھی فکرمند نہیں ہے۔ دیوسری گنگا میلی ہو کر اپنی روانی کھو رہی ہے۔ اس میں گندے نالے نالیوں کا پانی بہایا جا رہا ہے۔ پوجا کے سڑے ہوئے پھول ہماری ندیوں کا راستہ روک رہے ہیں۔ سروورں پر اب سورج کا عکس نہیں جھلملاتا کیوں کہ وہ کائی اور کیچڑ سے مرتے جا رہے ہیں۔ جھرنوں کے ذریعہ سوکھ رہے ہیں۔ دنیا میں ساگر، ندیوں اور جھیلوں کے کنارے جُوا گھر کھلتے جا رہے ہیں۔ خاصیت اور نقصان سے سنی ہماری دنیا میں گراہکوں کو ضرور جگایا جا رہا ہے پر وہ خاصیت کے گراہک نہیں ہیں۔ مندروں کے دروازے بھلے ہی کچھ وقت کے لیے بند ہو جائیں پر دوکانوں کے دروازے چوبیسوں گھنٹے کھلے ہیں۔

جب کسی ملک کے ناگرک صرف دوکانداروں میں بدل دیئے جاتے ہیں تو انہیں اپنے ملک کے ندی پہاڑوں، تال تلیوں، پیڑ پودوں، چرندوں پرندوں اور یہاں تک کہ اپنے انسانی خاصیتوں کی بھی کوئی فکر نہیں ستاتی۔ وہ صرف نیچر کا استعمال کرتے ہیں۔ ندیاں سوکھ جائیں، گندی ہو جائیں، زمین بنجر ہو جائے۔

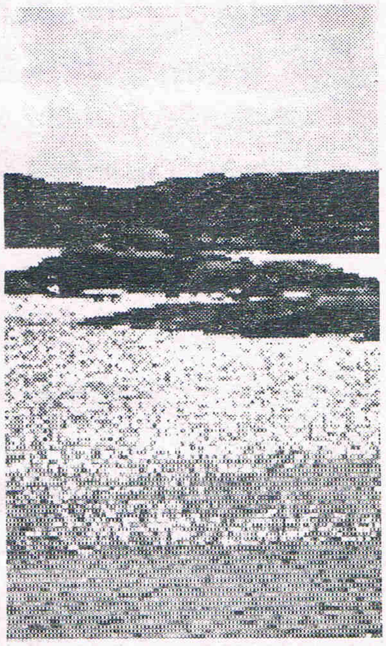

پرندوں کی نسلیں ختم ہو جائیں، ان سب باتوں کی وہ پرواہ ہی نہیں کرتے۔ وہ صرف اپنے فزیکل جسم کو بچا بچا کر ایک ٹھہرے ہوئے پانی سی زندگی جیے چلے جاتے ہیں۔ انہیں یہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی کہ ان کی آنکھوں کا پانی بھی مر رہا ہے۔ آنکھیں تو پوری زندگی کے پیار سے ہی بھرتی ہیں۔ زمین پر تالاب بھی ایسے ہی بھرتے ہیں۔ کورے ناروں سے نیر، جلوسوں سے پانی اور پانی پر کورے تبادلۂ خیال سے پانی نہیں بچے گا۔ پہلے وہ سب کے دل میں ہو تبھی سب مل کر زمین پر پانی کا راجیہ ابھیشیکھ کر سکیں گے۔ پانی تو زمین پر بار بار لکھی جاتی کویتا جیسا ہے۔

شہر میں پانی کی پریشانی سے نپٹنے کے کچھ طریقے

کے. جی. ویاس

شہروں میں پانی کی پریشانی کئی طرح کی ہوتی ہے۔ موٹے طور پر پائپ لائن کے پرانے ہونے اور پانی کی مانگ کے لگاتار بڑھنے کو پانی کی کم سپلائی کی وجہ بتایا جاتا ہے۔ کئی جگہ پر یہ سچ بھی ہے لیکن پانی کی مشکل کئی طرح کی ہونے کی وجہ ساری ذمہ داری سپلائی کی خامیوں پر ڈالنا صحیح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شہری علاقوں میں پانی کی کمی کی وجہ، پانی سپلائی کا معین وقت ہے۔ اس وقت بدلا پانی سپلائی کیا جاتا ہے۔ اس بدلے ہوئے پانی سے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ سپلائی کیے گئے پانی سے کچھ لوگ اپنی حقیقی ضرورتیں پوری کر پاتے ہیں تو کچھ لوگ اس کا استعمال فضول خرچی کی حد تک کرتے ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ جہاں پانی کی سپلائی کم ہے وہاں اس کا استعمال پینے یا کھانا بنانے میں کیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں سپلائی زیادہ ہے وہاں اس کا استعمال ضروری ضرورتوں کو پورا کرنے میں کیا جاتا ہے۔ ترک دیا جاسکتا ہے کہ غسل خانوں اور لانوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بدلے ہوئے پانی کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ پیسہ کی کمی کی وجہ کسی بھی شہر میں بدلے اور غیر بدلے پانی کے لیے الگ الگ پائپ لائن ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے بدلے ہوئے پانی کے استعمال کو کم کرنے کے لیے بدلے میں انتظام کے بارے میں سوچنا صحیح ہوگا۔ اس سال پانی کی پریشانی کا اثر شہری علاقوں میں کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس وجہ سے سرکاری عملہ کے ساتھ ساتھ رہنما بھی فکرمند ہیں۔ پانی کی کمی کی وجہ کارخانوں اور تکنیکی گوشٹیوں میں طریقوں پر بات چیت ہو رہی ہے اور راستے کھوجے جارہے ہیں۔ شہر میں پانی کی پریشانی سے نپٹنے کے لیے بہتر پانی کے انتظام کے ساتھ ساتھ جن نکتوں پر سوچا سمجھا جاسکتا ہے ان میں سے کچھ نکتے آگے دیئے گئے ہیں۔ پانی کی پریشانی کے کئی پہلوؤں پر لوگوں میں صحیح صحیح معلومات کی کمی ہے۔ اس کمی کی وجہ سے پانی کی پریشانی سے نپٹنے میں صحیح ڈھنگ سے خیال نہیں ہو پاتا اس لیے سب سے پہلے رہنماؤں کو پانی کی پریشانی کے دیگر پہلوؤں اور تکنیکوں کی فلاسفی سے دوچار ہونا ہوگا اور مانگ اور سپلائی سے جڑے متبادل کی معلومات حاصل کرنی ہوگی تاکہ

صحیح فیصلے لیے جاسکیں۔ کئی مرتبہ صحیح معلومات کے بغیر بیکار کے فیصلے ہوئے ہیں جس کی وجہ پچھلے دنوں بنی کئی پینے کے پانی کی اسکیم اپنے بھاری بھرکم خرچ کی وجہ نگری نکایوں کے گلے کی ہڈی بنی ہوئی ہے۔ اس لیے شہری عوام کے ساتھ سبھی متعلقین کے بیچ سمجھ میں اضافہ اور اس میں لگاتار سدھار کی ضرورت ہے۔ سوکھے کا سال ہمیں اس لٹریسی کو سماج کے سبھی فرقوں تک پہنچانے کا موقع دیتا ہے تاکہ ٹکاؤ آبی اسکیمس کو ضرورت کے مطابق تبادلۂ خیال کے بعد پانی اکٹھا کرنا، لاگت اور رکھ رکھاؤ پر ہونے والے لگاتار خرچ کے معائنہ کے بعد اپنایا جاسکے۔

شہری علاقوں میں پانی کے فالتو خرچ کو روکنے کے علاوہ حفاظت پر بہت زیادہ دھیان دیئے جانے کی ضرورت ہے۔ پچھلے کچھ سالوں سے شہروں میں چھت کے پانی کو اکٹھا کر زمین کے اندر پانی کے خزانوں کو بڑھانے کی سمت میں پہل ہوئی ہے۔ کچھ لوگ چھت کے پانی کو راجستھان اور گجرات کی طرز پر ٹانکوں میں اکٹھا کرنے کی سفارش کرتے ہیں۔ اس سفارش کے ساتھ ساتھ ٹانکوں میں اکٹھا پانی میں صفائی کو بنائے رکھنے کے لیے اسے روشنی سے دور کر ہوا کے ساتھ رکھنے اور پانی کے اندر چونے کی ہنڈی ٹانگنے کی ترکیب کو ترجیح دینے کی سجھائش دی جاتی ہے۔ جہاں تک چھت کے پانی کو صاف کر زمین کے اندر کے پانی کے خزانوں میں جانے کا سوال ہے تو اس طریقہ کی کامیابی تبھی طے ہے جب زمین کے نیچے ڈالا گیا پانی چٹان کی اس پرت کے درمیان میں آئے جو پانی سوکھتی ہے اور اس میں پانی سوکھنے کے لیے مناسب جگہ بھی موجود ہے۔ کئی مرتبہ زمین کے اندر کا پانی ریچارج کے لیے بنائے گئے سوک پٹوں میں کالی مٹی یا پیلی چکنی مٹی یا چھوئی مٹی پائی جاتی ہے۔ ایسے سوک پٹوں میں سبھی ضروری احتیاط کے باوجود زمین کے اندر کا پانی ریچارج نہیں ہوتا ہے اور سوک پٹ بنانے پر کیا گیا خرچ بیکار ہو جاتا ہے۔ یہ تکنیکی سمجھ کی کمی یا وسائل نہیں ہونے کی وجہ ہوتی ہے۔ شہری علاقوں میں سرکاری دفتروں، کارخانوں، کھیل میدانوں اور پارکوں میں مناسب کھلی جگہ پائی جاتی ہے۔ ایسی جگہوں میں زمین کے اندر کا پانی ریچارج یا سطح پر پانی اکٹھا کرنے کے لیے زخائر بنائے جاسکتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم شہری علاقوں میں نئی کالونیوں کی اجازت دیتے وقت جس طرح

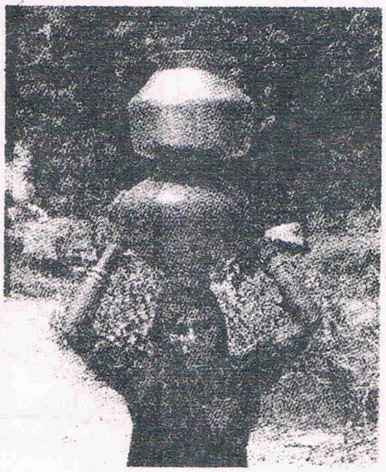

پارک، کھیل میدان وغیرہ کے لیے جگہ محفوظ رکھی جاتی ہے اسی طرح کالونی کے علاقوں سے بہہ کر جانے والے برساتی پانی کی تعداد کے مطابق مناسب سائز کی تکنیکی سے بہتر زخائر کو بندھ کاری بنایا جانا طے کریں۔

اسی طرز پر پرانی کالونیوں کے پارکوں وغیرہ میں کالونی سے نکلنے والے برساتی پانی کو محفوظ کرنے یا ریچارج کرنے کے لیے انتظامات کیے جاسکتے ہیں۔ کئی شہروں میں ڈرینج کی کمی یا ان کے ناکافی تعداد کی وجہ سے برسات کے دنوں میں باڑھ کی وجہ سے نچلے علاقے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ حالات جبلپور سمیت کئی شہروں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ صاف ہے کہ نچلے علاقوں میں آنے والی باڑھ کی وجہ اوپر موجود کالونیوں سے بہہ کر نکلنے والا برساتی پانی ہے۔ اس لیے اگر ہر ایک کالونی میں زمینی بناوٹ کو دھیان میں رکھ کر پانی اکٹھا یا زمینی پانی ریچارج کے لیے زخائر بنانا ضروری کر دیا جاتا ہے تو باڑھ سے کافی حد تک چھٹکارا مل سکتا ہے۔ سائنس داں بتاتے ہیں کہ شہری علاقوں کے کچھ حصے بہتر ڈھنگ سے قدرتی زمینی پانی ریچارج کو انجام دیتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان علاقوں کو پہچان کر انہیں خالی چھوڑا جائے۔ اور قدرتی طور پر بنائے گئے طریقے سے زیادہ سے زیادہ زمینی پانی ریچارج کیا جائے۔ شہری علاقوں میں اوپر دکھائے گئے طریقوں سے برساتی پانی کو روکنے، زمین کے نیچے ریچارج کرنے اور ٹانکوں میں پانی اکٹھا کرنے کی کوششوں سے سوکھے کنوؤں اور نل کوپوں کو زندگی ملے گی اور پارکوں، عمارتوں کی صاف صفائی اور دیگر لگاتار کاموں کے لیے ہر کالونی میں ضرورت کے مطابق پانی مہیہ ہوگا۔ اس انتظام کو لاگو کرنے سے شہروں کا پانی صاف کرنے پر ہونے والا خرچ کم ہوگا اور کسی حد تک پانی کی پریشانی سے نپٹا جاسکے گا۔ پانی اکٹھا کرنے کے کاموں میں عام طور پر مانگ اور سپلائی کے اصول کی اندیکھی کی جاتی ہے۔ سوکھے کے اس اصول کو زمینی پانی ریچارج اور پانی کے زخائر بنانے کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

پانی پر قبضے کا سوال

شبیر قادری

پچھلے کچھ سالوں سے انٹرنیشنل کمپنیوں کی گدھ درشٹی پانی یعنی نیلا سونا پر آ کر اٹک گئی ہے۔ ظاہر ہے وہ جانتی ہیں کہ آنے والے دنوں میں اس کی اہمیت زمین کے نیچے سے نکلنے والے کچے تیل سے بھی زیادہ ہوگی۔ اس لیے وشو بینک انٹرنیشنل مدرا خزانہ اور ان کے زیر نگرانی کام کرنے والی کئی انٹرنیشنل کمپنیوں اور تنظیموں نے طے شدہ پلان کے تحت پانی کو اکیسویں صدی کا سب سے بڑا ایجنڈہ اعلان کیا ہے۔ وہ بتا رہے ہیں کہ پانی کا نجی کرن کر اس کا استعمال زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے اور اس مشکل، اور بہت ضروری کام کو دنیا کی چند انٹرنیشنل کمپنیاں ہی کیسے کامیاب طریقہ سے کر سکتی ہیں۔ بار بار لکھا جا رہا ہے کہ اگلی عالمی لڑائی تیل کے لیے نہیں پانی کے لیے ہوگی۔ عالمی بینک کے آنکڑے چیتا رہے ہیں کہ دنیا کی آبادی کا چھٹواں حصہ پانی یعنی ایک ارب سے زیادہ لوگ پانی کی مشکل سے بیزار علاقے میں جینے کو مجبور ہونگے۔ اگر وقت رہتے ان کے لیے مناسب پانی کا انتظام نہیں کیا گیا تو سال ۲۰۲۵ء تک حالات خطرناک شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ پانی سے جوجھ رہی یہ آبادی ہندوستان، پاکستان اور چین کی ہے جو آنے والے کل کی تباہی سے بے خوف تقریباً بیفکر ہو سیاست کے کھیل میں مدمست ہیں۔ عالمی بینک کے آنکڑے بتاتے ہیں کہ اس وقت دنیا کے تقریباً ۳۱ ملکوں میں پانی کی بھاری کمی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر افریکی اور مدھیہ پورب کے ملک ہیں۔ ۲۰۲۵ء تک ۳۱ ملکوں کی اس فہرست میں ایتھوپیا، بھارت، کینیا، نائیزیریہ، اور پیرو جیسے ۱۷ ملک اور شامل ہو جائیں گے۔ یعنی کل تقریباً پچاس ملک پانی کی مشکل سے پوری طرح گھر چکے ہونگے۔ نتیجہ ہوگا کہ ہاہا کار مچے گا، مار کاٹ ہوگی اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوگا۔

مستقبل میں پانی کی پریشانی اور طے شدہ نجی کرن کے حوالہ میں دہلی میں اس سال کے شروع میں پیپلس ورلڈ واٹر فورم کا تین یومی جلسہ ہوا، جس میں دنیا بھر کے ۶۵ ملکوں کے تقریباً ۳۵۰ جل لڑاکوؤں نے شرکت کی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے ملکوں میں پانی کے نجی کرن کی مخالفت کر رہے ہیں۔ پیپلس ورلڈ واٹر فورم ایسے ہی لوگوں کا اسٹیج ہے جو پانی کو لوگوں کا بنیادی حق مانتے ہیں۔

اسی جلسہ کے کچھ دن بعد ممبئی شہر میں ایسا ہی ایک اور پروگرام ورلڈ سوشل فورم کے ذریعہ بھی منعقد

کیا گیا جہاں پانی کو پوری طرح کاروباری چیز بنا دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ پیپلس واٹر فورم کے بینر تلے جمع ہوئے فرانس، جرمنی، اٹلی، جیسے ترقی یافتہ ملکوں کے ساتھ ہی بیلزیم، اروگوے، اسکینڈینیویہ، السیلواڈور، نیپال اور گھانہ جیسے غریب ملکوں کے لوگوں نے کہا کہ انٹرنیشنل کمپنیاں زیادہ منافہ کمانے کے لیے پانی کے نجی کرن سے پہلے جنتا کو سبز باغ دکھاتی ہیں بعد میں عام جنتا کو سکہ ڈال کر اپنے ہی ملک میں پینے کا پانی خریدنا پڑ رہا ہے۔ کئی ملکوں کے رہنماؤں نے کہا کہ جنتا کو ان کمپنیوں کی بدسلوکی کے خلاف جنگ چھیڑ دینی چاہیے۔

معلوم ہو کہ دورِ حاضر میں کچے تیل کی جگہ اب پانی کا کاروبار تیزی سے عالمی شکل اختیار کرتا جارہا ہے۔ ۱۹۹۴ء سے لیکر ۱۹۸۸ء کے بیچ اس علاقہ کی انٹرنیشنل کمپنیوں کے ایک دوسرے میں ملنے کی قریب ۱۴۰ وارداتیں ہوئی ہیں۔ اس پیوست ہونے کا بازار قیمت قریب ۱۰ ارب پونڈ آنکا گیا ہے۔ آج جو کمپنی نمبر ایک ہے وہی کل دوسرے، تیسرے، پانچویں یا دسویں مقام پر پہنچ سکتی ہے۔ اس لیے ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ اس وقت دنیا میں پانی کا سب سے بڑا سوداگر کون ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اس دھندے میں شامل ٹاپ ٹین کمپنیوں میں ایزان نام کی بدنام سنستھا بھی شامل ہے جس نے ڈابھول پریوجنہ کے نام سے مہاراشٹرہ میں تہلکہ تو مچایا ہی وہاں کے معاشی حالات کی کمی بھی توڑ ڈالی تھی۔ ویسے فی الحال پانی علاقہ کی سب سے بڑی فرانسیسی انٹرنیشنل کمپنی وونیڈی ہے۔ دوسری سب سے بڑی کمپنی سویز لیونیج ڈیج ای آس ہے۔ یہ کمپنی بھی فرانس کی ہے۔ فی الحال دنیا کا ۷۰ فیصد نجی پانی بازار انہیں دو کمپنیوں کے قبضہ میں ہے۔ سویز کا دنیا بھر کے ۱۲۰ ملکوں میں کاروبار ہے تو وونیڈی کا ۹۰ ملکوں میں اور دونوں کا کل سالانہ بازار ۷۰ ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔ اس فرانسیسی کمپنی کا کاروبار ۸۰ ملکوں میں پھیلا ہے۔ پانی علاقہ کی تیسری بڑی انٹرنیشنل کمپنی بائیز ہے۔ برٹش انٹرنیشنل کمپنی یونائیٹڈ یوٹی لٹیز پانی علاقہ کی چوتھی بڑی کمپنی ہے اور اب امریکہ کی ایزان کمپنی نے بھی پانی کے علاقہ میں پیر پسارے ہیں جو پچاس ملکوں تک پھیلے ہیں۔ اس کے بعد جرمن کمپنی آر.ڈبلو.ای. کا بھی نام آتا ہے جس کا کل کاروبار اسی علاقہ میں ۵۰ ارب ڈالر ہر سال تک پہنچ چکا ہے۔ اس کے علاوہ ٹھنڈا پانی پلانے والی پیپسی، کوک اور نیسلے وغیرہ کمپنیاں بھی پانی کے بازار میں کود چکی ہیں۔ ایشیا، انگلینڈ، آسٹریلیہ، مدھیہ پورب، اور دکشن امریکہ کے کریب دو کروڑ سے زیادہ لوگوں تک سیورن ٹرینٹ نام کی ایک اور سنستھا پانچ بڑے ٹاپوں کے تقریباً ۸۰ لاکھ لوگوں تک اپنے پانی کا ذائقہ پہنچا چکی ہیں۔ جانکاروں کا ماننا ہے کہ پانی کی ان دس بڑی کمپنیوں نے ابھی تک پچاس کروڑ لوگوں تک اپنا اپنا پانی پہنچایا ہے اور ترقی کی یہی رفتار رہی تو آنے والے دو تین سالوں میں ہی انکی پہنچ ۱۰۰ کروڑ لوگوں تک آسانی سے ہو جائے گی، جبکہ اس طرح پانی کے کاروبار میں ان کی حصہ داری ۵۰۰

ارب ڈالر ہو جائے گی۔

تیزی سے اپنی ترقی کا گراف چومتی ان انٹرنیشنل کمپنیوں نے اب بھارت کے لیے بھی پانی کا ایجنڈہ تیار کیا ہے۔ مطلب ہمارے گھروں، کھیتوں، کھلیہانوں میں غیر ملکی کمپنیاں پانی کا انتظام کریں گی۔ اس تعلق میں عالمی بینک کے ذریعہ ۱۹۸۹ء میں انیشی ایٹنگ اینڈ سسٹیٹنگ واٹر سیکٹر رفارمس پی اے سنتھی سس نام سے چھ حصوں میں ۴۰۷ ور اور ۱۴۳۵ روپیہ کی یہ کتاب شائع کی دہلی کے الائڈ پبلی کیشن نے۔ دلچسپ یہ بھی ہے کہ ہمارے جل سنسادھن منترالیہ نے اسے تیار کروانے میں خاص کردار ادا کیا ہے۔ دنیا کی ان چھ رپورٹس میں بھارت کی بڑھتی آبادی، نگری کرن اور اودھوگی کرن کی تیز پر کر یہ اور گھٹتے پانی کے سنسادھنوں کی بھیانک تصویر پیش کی گئی ہے۔ ان رپورٹوں میں کہا گیا ہے کہ اگر بھارت لگاتار معاشی ترقی کی سوچ رکھتا ہے اور ساماجک اور پریاورنیہ حالات میں سدھار کرنا چاہتا ہے تو اسے پانی کے انتظام میں بنیادی بدلاؤ لانا ہوگا۔ رپورٹ یہ بھی بتاتی ہے کہ بھارت میں گراؤنڈ واٹر کا انتظام بہت کمزور ہے جس کے چلتے بجلی کی پورتی ٹھیک طریقہ سے نہیں ہو پاتی۔ نتیجتن ایگر کلچر علاقہ بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ گراؤنڈ واٹر کے حالات سے نپٹنے کے لیے رپورٹیں نئے قانون بنانے کی سفارش بھی کرتی ہیں۔ عالمی بینک نے جن سفارشوں کو ان رپورٹس کے ذریعہ سے لاگو کیے جانے کی وکالت کی ہے اس کے تحت کوئی بھی انسان اپنے گھر میں نہ ہینڈ پمپ لگوا سکتا ہے نہ کنوا بنوا سکتا ہے اور نہ کوئی تالاب کھدوا سکتا ہے۔ ایسا اس لیے کہ پانی انتظام سے متعلق یہ نیا قانون گراؤنڈ واٹر پر انٹرنیشنل کمپنیوں کا ایک ہی حق ہوگا اور عام آدمی پانی کے لیے ترس اور تڑپ اٹھے گا۔ یہ ٹھیک ویسا ہی ہوگا جیسا کہ عرب ملکوں میں کسی انسان کے گھر کے اندر کی زمین سے نکلنے والے تیل پر اس انسان کا حق نہیں ہوتا۔ اگر عالمی بینک کی ان رپورٹس کو سرکار کے ذریعہ مان لیا جاتا ہے تو طے مانیے کہ ہمارے ملک کے لوگوں کو بوند بوند پانی کے لیے ودیسی کمپنیوں سے بھیک مانگنی ہوگی۔ کیوں کہ انہیں کمپنیوں سے لائسنس حاصل کر ہی آپ ہینڈ پمپ لگا سکتے ہیں، کنوا کھود سکتے ہیں، ٹیوبویل لگا سکتے ہیں۔ اب اگر آپ کے پاس پیسہ ہے تو لیجئے پانی ورنہ مریے پیاسے۔

عالمی بینک کے نجی کرن کی انہیں سفارشیوں نے پانی کی فکر کرنے والوں کی نیند اڑا رکھی ہے۔ ہر ایک اسٹیج سے اس کے خلاف آواز سنائی دینے لگی ہے پر پانی کے نجی کرن کی طرفداری میں بھی کچھ لوگوں کے جائز ترک ہیں۔ ایسے طرفداروں کا خیال ہے کہ ہم اپنے ملک میں ہر سال ۳۸۰ ارب گھن میٹر زمین سے پانی نکالتے ہیں، جس کا ۹۳ فیصد اگری کلچر میں، چار فیصد، انڈسٹریز میں اور تین فیصد گھریلو استعمال والے پانی کا ۸۰۔۹۰ فیصد زمینی پانی ہوتا ہے، جبکہ اگری کلچر اور انڈسٹریز میں آدھا آدھا ہم زمینی اور سطح کے پانی کا استعمال

کرتے ہیں۔صرف ایگری کلچر کے لیے ہمارے یہاں ایک کروڑ ستر لاکھ پمپنگ سیٹوں کا استعمال ہوتا ہے، لیکن یہ پورا پانی یا تو مفت ہے یا اس پر بھاری سرکاری گرانٹ ملتی ہے۔اس کے خلاف کچھ علاقوں میں اب پانی ملنا بند ہو گیا ہے۔نمونہ کے لیے سوراشٹرہ میں جہاں ۱۰۰ فٹ کی گہرائی پر پانی مل جایا کرتا تھا اب ۱۸۰۰ فٹ نیچے بھی مشکل سے پانی ملتا ہے۔یہی حالات بھارت کے دیگر صوبوں کے بھی ہیں۔سچ یہ ہے کہ ابھی تک ہم پانی کے لیے گمبھیر نہیں ہوئے ہیں۔اسے ہمنے کبھی ختم نہ ہونے والا مفت کا مال سمجھ رکھا ہے۔عالمی بینک کا خیال استقبالیہ ہے کہ پانی کہاں سے لیا جائے، کیسے لیا جائے اس پر بھی کئی ملکوں کی سرکاروں کو صاف پلان بنانا ہوگا۔ اس نے کہا ہے کہ پانی کی اہمیت سمجھ میں آئے اور وہ غیر ضروری پانی برباد نہ کریں ایسے اور بھی کئی بھاؤ پانی کے نجی کرن کے حمایتیوں اور عالمی بینک نے دیئے ہیں۔پر پانی کے نجی کرن کو لیکر دکشن امریکہ کے ملک بولی بیا میں انٹرنیشنل کمپنی کے ذریعہ معصوم لوگوں پر پانی کی کوالٹی اور پانی کے انتظام میں تکنیکی سدھار کے نام پر پانی کی دروں میں اچانک ۴۰۰ گنا اضافہ کر جس طرح سے ظلم ڈھائے گئے، اس نے خون خرابا کا نیا سبق ہی نہیں رچا سیاست کی چولیں بھی ہلا دیں۔کئی لوگوں کی جانیں گئیں، مارشل لا لاگو ہوا۔آخر کار غیر ملکی انٹرنیشنل کمپنی کو اپنا بستر باندھ کر بھاگنا پڑا۔تو کیا ہمارے ملک میں عالمی بینک کی سفارشوں کو ماننے اور پانی کا نجی کرن کر دینے پر بھی ایسے ہی حالات پیدا ہونگے؟ پانی کے نجی کرن کے نام پر سینکڑوں گنا پانی کے دام نہیں بڑھائے جائیں گے۔یا غیر ضروری کسی بھی تشددی آندولن میں عام لوگوں کو نہیں جوجھنا پڑے گا۔ایسے کئی سوالوں کا جواب کس ذمہ دار سیاسی پارٹی یا رہنما کے پاس ہے۔

ہمیشہ سے ہی غیر ملکی کمپنیوں نے کسی بھی دوسرے ملک میں احسان کے لیے اپنے پیر نہیں پھنسائے۔صرف پیسہ کمانے، منافع کمانے کے لیے وہ نئی نئی سازشیں رچتے رہتے ہیں۔افسوس یہ ہے کہ کرسی کے کھیل میں مست، بوتل بند پانی پینے والے ہمارے رہنما ملک میں حاصل پانی کے اچھے انتظام میں بھی بار بار فیل ہوئے ہیں۔اگر ایمانداری سے ہی پانی کا انتظام کر دیا گیا تو ہمیں ودیسی یوجنا کو لاگو کرنے کی نہ تو ضرورت پڑے گی اور نہ پیاسہ مرنے کی نوبت آئے گی۔اس سمپدا کے نیوجت وترن، دوہن اور اچھے انتظام کے ذریعہ ہم مستقبل کی امکانی مشکلات سے کامیابی سے نپٹ سکتے ہیں اور اس کے لیے ہم سرکار سے صرف امید ہی کر سکتے ہیں۔

آج بھی کھرے ہیں تالاب

سریندر بنسل

آج ہمارے حکمران کے پاس کتابوں میں پڑھائے جانے والے اس کوے جتنی بھی سمجھ نہیں بچی، جس پیاسے کوے کی کہانی آزادی کے بعد ملک کے سرکاری اور اجلی ڈریس والے سبھی اسکولوں کی کتابوں میں پڑھائی جاتی رہی ہے۔ ہم سب نے دیکھا کہ جیسے ہی ملک کی سرکار یا صوبئی سرکاروں پر سرکاریں گرنے کا خطرہ منڈرانے لگتا ہے، تو وزیراعظم سے لیکر وزیر اعلیٰ تک خود کو بیچارے یعنی کسان ماننے لگتے ہیں۔ حالانکہ ان کی عام زندگی میں کسانی کردار کی کوئی جھلک کبھی دکھائی نہیں دیتی اور نہ ہی ان کے صوبوں میں ایسی کوئی اسکیم ہی دکھائی دیتی ہے جو کسانوں کے سچ مچ فائدہ میں ہو یا زمینی پانی کو لیول میں کرتی دکھائی دیتی ہو۔ پنجاب ہریانہ کا نمونہ بالکل صاف ہے۔ کسان وزیر اعلیٰ یا کسانوں کے حق میں راج کرنے کا بگل بجانے والے دو صوبے آج گرتے زمینی پانی کی وجہ سے سب سے زیادہ مشکل میں ہیں۔

دہلی کے گاندھی شانتی پرتشٹھان سے چھپی ۱۹۹۳ء میں ایک کتاب جس نے ملک کے سبھی صوبوں میں ہزاروں کارکنوں کے دل دماغ کو نہ صرف متاثر کیا، بلکہ اپنے علاقے کا بھروسہ مند کارکن بھی بنایا۔ دہلی سے چھپ کر ''آج بھی کھرے ہیں تالاب'' نام کی کتاب دیس ودیس تک جا پہنچی لیکن سرکاروں کے چراغ تلے ہمیشہ کی طرح اندھیرا ہی رہا۔ جس ۷۵ روپیہ کی کتاب کی وجہ لاکھوں لوگ اپنے پانی کے ذریعوں سے جڑ گئے۔ اسی ملک کی سرکاریں آبی زخائر سے لوگوں کو جوڑ کر ندیا جوڑنے کی بات کر رہی ہیں۔ سب کو آپس میں جوڑنے والی ہندوستانی تہذیب جیسی آسان اور گہری کتاب آخر سرکاروں کو کیوں نہیں دِکھتی؟ لیکن پھر بھی ہم سب کا یہ فرض ہے کہ بے شک ہمارے پاس ڈھول خریدنے کے پیسے نہ ہوں بہرے حکمران کے سامنے کنستر ضرور پیٹنا چاہیے تاکہ انہیں دکھے کہ ایک ۷۵ روپیہ کی کتاب نے کیسے انتظاموں، روزی روٹی کمانے میں ہی تھکے ٹوٹے لوگوں میں کیسے اپنی سمے سدھ اور سوم سدھ رواجوں کے لیے کیسے نئی امنگ بھر دی ہے۔ آیئے آج بھی کھرے ہیں تالاب کتاب کے ساتھ ان صوبوں، کارکرتاؤں کے دروازے تک چلیں، جہاں جہاں اس کتاب نے الکھ نرنجن کہا ہے۔

دنیا میں بہت کم ایسی کتابیں ہوتی ہیں جو نہ صرف پڑھنے والے تلاشتی ہیں بلکہ انہیں تلاشے گئے

پڑھنے والوں کو معتقد سماجی کارکنوں کی شکل میں بھی بدلتی ہیں۔ ایسی ہی ایک کتاب ہے شری انوپم مشر کے ذریعہ لکھی گئی گاندھی شانتی پرتشٹھان کے ذریعہ شائع ''آج بھی کھرے ہیں تالاب''۔ اس کتاب نے نہ صرف لاکھوں پڑھنے والے تلاشے، بلکہ انہیں تلاشے گئے لوگوں کو معتقد سماجی کارکنوں کی شکل میں ڈھالا۔ لاکھوں پڑھنے والوں کو اپنی زمین سے جوڑتے ہوئے اپنی مٹی، اپنے جنگل، اپنے تالابوں سے جوڑا اور انہیں بچانے کے لیے اکسایا۔ کتاب چھپنے کے صرف دس سال کے سفر میں ہی تقریباً سارے ہی ملک میں آوارہ مسیح بن کر گزر رہی ہے۔ انوپم جی کے ڈھائی آکھر پریم سے پُر اندوز مضامین، دلیپ چنچالکر کے ذریعہ دل کی گہرائی سے بنائے گراف، شینا کے شودھ اور منجوشری کے سنیوجن میں تیار یہ بے حد دلچسپ کتاب سوکھے علاقوں میں میگھ دوت بن کر برستی جارہی ہے۔

پورے بھارت میں تالابوں کی، پانی کے لیے عزت کی کیسی زمینی تہذیب اپنے اس ملک میں تھی اس کو ''آج بھی کھرے ہیں تالاب'' کتاب انجلی میں بھرے آچمن کے پانی میں ان زمینی روایتوں کی جھلک دکھاتی ہے۔ تالابوں کی تعمیر کے طریقوں کے ساتھ ساتھ انوپم جی کی قلم کاری بے حد آسانی کے ساتھ ان گمنام بھلا دیئے گئے ہیرو کو بھی عزت سے پھولوں کی مالا پہنا کر سب کی جھلک کے لیے باہر نکال لاتی ہے جنہیں بغیر جذبہ پڑھائی پڑھ گئے سماج نے پچھڑا سمجھ ناک منہ سکوڑ لیا ہے۔

کتاب کی پہلی جلد ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی پانچویں جلد ۲۰۰۴ء میں نکلی۔ یہ کتاب اتنی ہی سناتن اور نئی بنی ہوئی ہے۔ انوپم جی خود اس کتاب کی کامیابی کے بارے میں قبول کرتے ہوئے کہتے ہیں'' یہ کتاب ۱۹۹۳ء میں جب پہلی بار چھپی، تب سے لیکر جگہ جگہ لوگوں نے اپنے پرانے تالابوں کو بچانے اور نئے تالاب بنوالے کا کام شروع کیا ہے۔ یہ کافی بڑی زنجیر، اسے گنانا شاید اب ممکن نہیں۔ انوپم جی دوہراتے ہیں کہ ہم ایسی کئی خزانہشوں کے آگے سر جھکاتے ہیں کیوں کہ انہیں خزانہشوں کے چلتے دھیرے دھیرے ہمارے ماتھے میں جمی گاد کم ہوئی ہے اور آج راج اور سماج کو پھر لگنے لگا ہے کہ تالاب تو ہمیشہ سے ہی کھرے ہیں۔''

میگسیسے انعام سے اعزاز یافتہ، پانی کے جھرنہ کو ملک بھر میں چھڑکنے والے پانی کے جھرنیں راجندر سنگھ بھی مانتے ہیں کہ راجستھان میں ترون بھارت سنگھ کے کام کاجی علاقہ کے کام کو کامیاب بنانے میں اس کتاب کا بہت بڑا تعاون رہا ہے۔ لوگوں کو یہ کتاب اپنی کتاب لگنی ہی تھی، سرکاری ملازموں تک کو جو نوکری کا پہلا دستخط اور پہلی تنخواہ کے بعد ہر کام سے اوبنے لگتے ہیں ان کی پیشانی سے بھی اس کتاب نے شلیں ہٹائیں۔ ہر جگہ لوگوں کو اپنے اپنے علاقے کے تالابوں تک راجو گائڈ کی طرح ہنستے گاتے پہنچایا۔

مدھیہ پردیش میں ساگر ضلع کے کلکٹر شری بی.آر. نائڈو (آئی.اے.ایس.) جنھیں ہندی بھی ٹھیک سے نہیں آتی تھی نے کتاب پڑھ کر پورے حوصلے سے بھر کر جگہ جگہ لوگوں سے کہتے کہ اپنے تالابوں پر کام شروع کرو۔ بس آپ کام شروع کرو، حاکم آج نہیں تو کل جاگے گا۔ شری نائیڈو کی چھوٹی سی الکھ ساگر ضلع کے تقریباً ۱۰۰۰ تالابوں کو نرجن کر گئی۔ اسی طرح شیوپوری ضلع کے تقریباً تین سو چالیس بسرے تالابوں کی سدھ لی گئی۔ مدھیہ پردیش کے ہی سیدھی اور دموہ کے کلکٹروں نے اپنے اپنے علاقے میں اس کتاب کی سو سو کاپیاں بٹوائیں۔

اسی طرح گجرات کے ہیروں کے تاجر جو صرف اپنے ہیروں کی چمک کے پار کچھ نہیں دیکھ پاتے تھے، تالاب بچانے کے لیے آگے آئے۔ انہیں لگا کہ صرف ہیروں کی ہی چمک زیادہ لمبی زندگی نہیں دے پائے گی۔ ان کاروباریوں نے تالاب بچانے کے لیے پوری تحریک چلائی۔ راجستھان کا معاشرہ جو برسات کا پانی بچانے میں سب سے قوتی سماج رہا ہے اس کو بھی اس کتاب نے نئی روشنی دی۔ راجستھان کے محنتی مزدوروں نے اسی کتاب سے عبرت پا کر پورے صوبے میں سینکڑوں تحریک چلائی ہیں۔

جیپور ضلع کے لاپوڑیا گاؤں نے اسی کتاب سے حوصلہ پا کر نہ صرف وہاں کے تالاب بچائے بلکہ وہاں کی چاراگاہیں، گوچر بھی بچائے۔ ایسی ہی جدوجہد سے انہیں شری چھمن سنگھ عرف بناجی جیسا ہیرو بھی مل گیا۔ آج اکیلا لاپوڑیا گاؤں صرف اپنے تالاب، گوچر بچانے سے ہی جیپور ڈیری کو سال بھر میں ۳۰ لاکھ روپیہ کا دودھ دے رہا ہے۔ چھمن سنگھ کی رہنمائی میں ہزاروں گاؤں والوں کو گاؤں میں ہی کاروبار مہیہ ہوا۔ سب نوجوان گاؤں کے تالاب اور گوچر بچانے میں جٹے ہیں۔ ایسی خزانہشوں سے تقریباً ۹۰ گاؤں سے کوچ کرنا بالکل رُک چکا ہے۔

اترانچل میں پوڑھی گڈھوال کے افریکھال علاقہ کے دودھاتولی لوک وکاس سنستھان کے شری سچیدانند بھارتی اس کتاب سے اتنے زیادہ متاثر ہوئے کہ وہ سب کام چھوڑ تالاب دھن کو ہی رام دھن سمجھ جٹ گئے۔ پہاڑوں میں پرانی پڑ چکی چالیس (پہاڑوں میں برسات کا پانی روکنے کی روایتی طریقہ کا نام) پھر سے زندہ ہونے لگا۔ شری سچیدانند بھارتی کی خزانوں کی وجہ سے اب تک ان کے علاقہ میں تقریباً ۱۰۰۰۰ چالیں بن چکی ہیں۔

غیر ہندی بھاشی کرناٹک، وہاں اس کتاب کا اثر سیدھے ریاستی سرکار پر ہوا۔ انہوں نے وہاں تالابوں کو زندگی دینے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہاں ایک سیم سرکاری تنظیم 'جل سنوردھن یوجنا سنگھ'' بنائی گئی۔

اب یہاں عالمی بینک کی مدد سے تالاب بچانے کی بہت بڑے پلان کی اسکیم تیار کی ہے۔

اسی طرح ہرت کرانتی کے جیہادی نارے کے بعد بنجر ہونے کی طرف بڑھتے پنجاب کے ایک بے روزگار آدمی نے ترکش نام کا ایک رسالہ میں اس کتاب کا پنجابی ترجمہ سیریل کی شکل میں چھپوایا۔ بعد میں اسی آدمی نے بیحد خراب مالی حالت کے باوجود اسے پنجابی زبان میں کتابی شکل میں چھپوایا۔ پہلی جلد ۵۰۰ کاپیوں کی تھی جو مہینہ بھر میں ختم ہوگئی۔ اب وہی بے روزگار آدمی ہریانہ کے شاہ آباد مارکنڈہ سے اس کی دوسری جلد (۲۰۰۰ کاپیوں کی ہے) ہمارا پریاورن نام کی سنستھا تلے چھپ رہا ہے۔ اس کا پلان ہے کہ پنجابی ترجمہ کی یہ دوسری جلد پنجاب، ہریانہ کے خاص پنجابی رائٹروں، سنتوں، مہنتوں، گرودوارہ انتظامی کمیٹی اور سناتن مذہب جلسوں، گاؤں گاؤں بنی نوجوان سبھاؤں، خاص پنجابی گلوکاروں اور کچھ بڑے کاروباریوں تک پہنچایا جائے تاکہ پنجاب ہریانہ کے لگاتار گرتے زمینی پانی کو اوپر اٹھانے میں کچھ بیداری بڑھائی جا سکے۔

بنگال کا قصہ بھی مزیدار ہے۔ ہتھیار گرائے جانے سے سرخیوں میں آئے چھوٹے سے قصبہ پرولیا کی ایک گھمکڑ صحافی نروپما عہدہ دار سوکھے علاقے کا دورا کرتی کرتی ایک ایسے گاؤں میں رکی جہاں اسے ہریالی دکھی۔ اس نے کچھ گاؤں والوں سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ گاؤں والوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں کچھ تالاب ابھی زندہ ہیں۔ یہی بات ان کی رہنما بنی۔ ان کے ایک کہانیکار دوست شری شیام اویناش نے انہیں تالاب والی یہی کتاب دی اور نروپما پڑھنے کے بعد تن، من، دھن سے اس کا ترجمہ بنگلہ میں کرنے میں جٹ گئی۔ بہت کمی ہونے کے باوجود انہوں نے بنگلہ لپی میں اسے چھاپا اور بنگالی ترجمہ ب دوسری بار چھپ کر آ چکا ہے۔ نروپما نے اس کتاب کے لیے ٹھیک ویسی ہی محبت دکھائی جیسے ایک وقت بنگال کی عورتوں نے شرت چندر کی کتابوں کے لیے دکھائی تھی۔ اب ان کے ایک دوست شری مکھرجی اس کتاب کے انگریزی ترجمہ میں جٹے ہیں۔

ہر ایک گاؤں سے گزرتے ہوئے اس کتاب کے قصے مہاراشٹرا بھی پہنچے۔ وہاں اورنگ آباد کے مشہور انجینئر شری مادھو چتلے جو کبھی دہلی میں جل سنسادھن منترالیہ میں سکریٹری بھی رہ چکے تھے، ان کے ہاتھ یہ کتاب لگی۔ انہیں لگا کہ اس کا فوراً مراٹھی میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ حالانکہ یہ کتاب آج کی انجینئرنگ تعلیم کے خلاف ہے لیکن پھر بھی اورنگ آباد سنسکرتی منڈل نے اسے مراٹھی میں چھاپا۔

گجرات زلزلہ میں برباد ہو چکی ایک تنظیم نے بھی اس کتاب کو چھاپنے کا بیڑا اٹھایا۔ شری دنیش بھائی سانگھوی نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے خود کو خوش قسمت پایا۔ اسی کڑی میں گجراتی اخبار جنم بھومی پرواسی

نے کتاب کو سیریل کی شکل میں چھاپا۔ پورے ملک میں امرت چھڑکنے کے بعد یہ کتاب ایک فرانسیسی ہندی وِدوشی اینی مونتو کے ہاتھ لگی۔ انہوں نے اس کا فرینچ میں ترجمہ کر جنوبی افریکی مروصوبوں میں پانی کے لیے جوجھتے لوگوں کو سونپا جہاں یہ کتاب ان کے مروصوبوں کی پیاس چھٹلانے کے لیے گرمیٹے کا کام کررہی ہے۔

بیشک آج بھی کھرے ہیں تالاب، آوارا مسِتی بن کر اپنی مسیحائی بانٹتی جارہی ہے۔ گاندھی پرتشٹھان نے ۱۹۹۳ء سے ۲۰۰۴ء تک اس کے پانچ سنسکرنوں میں کل ۲۳۰۰۰ کاپیاں چھاپی ہیں۔ لیکن ملک کے کئی سنستھانوں نے، ملازمینوں نے اپنے اپنے چھوٹے بڑے ذرائعوں کے ذریعہ اسے ایک لاکھ چھبیس ہزار تک پہنچادیا ہے۔ ملک میں آزادی کے بعد اور دوسری کسی کتاب کا ایسا نمونہ نہیں ملتا جسے ملک کے لوگوں نے پورا کیا۔ اور ان سے سبق لیکر اپنی ختم ہوچکی روایتوں کے پاس پہنچے جو پچھلے ۲۰۰ سالوں کی اٹپٹی تعلیم کی وجہ سے اور بدانتظامی کی وجہ سے دھول سے بھر چکی تھیں۔ ایک مزیدار بات یہ بھی ہے کہ ہر ہفتہ دہلی جیسے بڑے شہر کے دریا گنج علاقہ میں سجنے والے رویوار یہ پستک بازار میں پچھلے دس سالوں میں اس کتاب کی ایک بھی کاپی سڑک پر بکنے کے لیے نہیں آئی ہے۔

بھارت گیان وگیان پریشد دہلی نے اس کی پچیس ہزار کاپیوں کی ایک چھوٹی جلد چھاپی۔ مدھیہ پردیش جن سمپرک وبھاگ نے پچیس ہزار کاپیاں چھاپ کر سبھی پنچایتوں، ضلع پرشاسن اور نگرنکایوں میں مفت بانٹیں۔ بھوپال کے راجیہ سنسادھن کیندرہ نے بھی پانچ سو کاپیاں چھاپیں اور تقسیم کیں۔ احمد آباد کی اتھان ماہتی نام کی سنستھا نے پانچ سو کاپیاں چھاپ کر بانٹیں۔ ناگپور کے سوراجیہ پرکاشن سموہ نے بھی ہندی میں پانچ ہزار کاپیاں شائع کیں۔ بہار کے جمال پور علاقہ کی ایک تنظیم نئی کتاب نے بھی گیارہ سو کاپیاں شائع کرا سے عام لوگوں تک پہنچایا۔ اب نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے اسے تیرہ زبانوں میں ایک ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ ملک کے تقریباً آٹھ ریڈیو اسٹیشنوں سے اس کا سیریل ریلیز ہوچکا ہے۔ کپارٹ کی سوہاسنی ملے نے اس کتاب پر تقریباً بیس منٹ کی فلم بھی بنوائی ہے۔ سیما رانا کے ذریعہ بنائی گئی فلم ٹیلی ویژن پر سات آٹھ مرتبہ ریلیز ہوچکی ہے۔ بھوپال (مدھیہ پردیش) کی پریاورن کی ایک میگزین ''نیچر ٹڈے'' کے ایڈیٹر جناب شبیر قادری نے اس آبِ حیاتی کتاب کے سمان میں اپنی میگزین میں اس کتاب کو جیوں کا تیوں چھاپ کر دور دور تک پہنچایا۔ اب شری قادری نے اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے، جسے مدھیہ پردیش جن سمپرک وبھاگ کی مدد سے چھاپا گیا ہے۔

پنجاب میں نابھا میں واقع مہرم پبلی کیشن کے ایڈیٹر شری بی. ایس. بیر اس کتاب کو اپنی خاص

میگزین ماڈرن کھیتی میں سیریل کی شکل میں چھاپ رہے ہیں۔علی گڑھ
سے شائع ہونے والی میگزین ہماری دھرتی نے بھی اس کا سیریل چھاپنا شروع کردیا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب انسان ندیوں، میٹھے پانی کے ذریعوں میں اپنی ماں کا سایہ ڈھونڈتا تھا لیکن بھگدڑی ترقی کی کھوکھو کے اس دور میں ہم نے خود پانی کے ذرائع اجاڑ لیے ہیں۔لوگ آبی ذرائعوں کے کناروں سے اجاڑے جارہے ہیں۔اس بیہودی ترقی نے ہماری تعلیمی طریقہ، ہمارے نیتی کار، اسکیم بنانے والے اور بن پینڈی کے وہ سب لیڈر جن کے دماغوں میں صرف روزگار ہی روزگار بھرے ہیں، کہیں بھی کوئی ہریالی نہیں، اس میں سب شامل ہیں۔آزادی کے بعد بنائے گئے باندھوں کی وجہ سے تقریباً چار کروڑ لوگ اجاڑے جاچکے ہیں۔ندیوں کو جوڑنے سے بھی ایسے ہی واقعے سامنے آئیں گے۔

دہلی کے بڑے بڑے جلسے منعقد کرنے والوں نے جہاں ہندی رائٹر سفید کپڑے پہن ہندی کتابوں کو نہ پڑھنے والے لوگوں کا رونا روتے ہوئے اپنے لیکچر کے جالے لگاتے رہتے ہیں وہیں انوپم مشر کی یہ کتاب ان سب رائٹروں کے سامنے سے بیحد محبت، بڑی نرمی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بار بار نکلتی رہتی ہے۔یہ یاد دلاتے ہوئے کہ صرف کاغذ کالے کرنے کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ڈھائی آکھر پریم کا بھی ہونا چاہیے۔شری انوپم مشر نے''آج بھی کھرے ہیں تالاب'' کتاب کے ذریعہ سے بھٹکی ہوئی نیکیاں کمائی ہیں۔بھگوان انہیں ملک کے ہر ایک صوبے کے ہر ایک کونے میں گائے جانے والے لوگ گیتوں جتنی عمر عطا کرے۔جس کتاب کی وجہ سے اپنے آبی ذرائعوں سے لاکھوں لوگ جڑ گئے ہوں، وہیں ندی جوڑ جیسی آتنکی پلان بنانے والے پلانروں کے پاس پانی کے لیے بھٹکتے پیاسے کوے جتنی بھی سمجھ نہیں بچی ہے کہ ایسی کتابوں میں اور کتاب کی وجہ سے اپنے آبی ذرائعوں سے جڑے لوگوں کے دل میں جھانک ہی لیں۔

(उर्दू की इस पुस्तक की हिन्दी में रूपांतरित प्रस्तावना)

पेश लफ्ज़

मौसम की जबरदस्त तबदीलियां पूरी दुनियां पर अपने असरात छोड़ रही हैं और इन्सान के लिए बनाए गए कुदरती इनामात एक–एक कर धीरे–धीरे खत्म होते जा रहे हैं। इन्हीं इनामात मे से एक है पानी जिसकी कमी की आवाज हमे मुल्क के हर सूबे और हर शहर से सभी मौसम में तो साफ सुनाई देती ही है कमोबेश दुनियां के दीगर मुमालिक भी इन दिनों पानी के बोहरान से दोचार हैं। पानी की कमी अगर सिर्फ कुदरती मौसम की बदमिजाजी का असर है तो इसमें हमारी भी बदकारगुजारी भी शामिल है। जिस बेतरतीबी से हमने जमीन के पानी को निकालकर उसे माले–मुफ्त और दिले–बेरहम की शक्ल दी है और गांव या शहरों में मौजूद पुराने तालाब और कुंओं को खत्म कर उनका बुजूद मिटा दिया है उसी का नतीजा है कि मुल्क के कई सूबों में पानी की किल्लत आम दिनों मे भी साफ दिखाई देती है। गांवों के छोटे किसान और मजदूर रोजाना बड़ी तादाद में गांवो से रोजगार की तलाश में शहर का रूख कर रहे हैं, नतीजतन शहर के लिए बनाई गई स्कीमें भी बढ़ती आबादी की बजह से बेअसर साबित हो रही हैं। सिर्फ पानी ही वो शे है जिसकी भरपूर दस्तयाबी न सिर्फ गुरबत ओर बेरोजगारी को खत्म कर सकती है बल्कि तरक्की और खुशहाली का रास्ता भी बताती है। मशहूर माहिरे माहोलियात जनाब अनुपम मिश्र ने यूं तो कई किताबे लिखी हैं, मगर पानी बचाने और अपनी पुरानी तहजीब को जिंदा रखकर कुओं, तालाबों और पानी के दीगर वसाइल को बचाने के नुस्खे बताने वाली और दुनियाभर में तहलका मचाने वाली उनकी मुख्तसर किताब "आज भी खरे हैं तालाब" जिसे नई दिल्ली के गांधी शातिं प्रतिष्ठान ने शाया किया है और राजस्थान के जोधपुर के पास के एक मामूली से गांव पर मुन्हसिर किताब उनकी एक दीगर किताब "गोचर का प्रसाद बांटता लापौड़िया" जिसे नवयुबक मेग्सेसे अवार्ड से नवाजे गए मशहूर माहिर माहोलियात और पानी बचाने मे मुल्क भर का दौरा कर रहे नौजवान साथी राजिन्दर सिंह की तन्जीम तरूण भारत संघ जोधपुर ने शाया किया है, ने अनुपम मिश्र को पूरे हिन्दोस्तान में

हमेशा–हमेशा के लिए न सिर्फ लोगों के दिलों में जगह दी है बल्कि बंजर होती और अकाल में तबदील होती जमीन को हराभरा बनाने और लगभग सूख गए तालाबों और कुंओ को पानी से लबरेज कर छलछलाने पर मजबूर किया है। इन्हीं किताबों का नतीजा है कि हिन्दोस्तान के कई सूबे और शहर जहां पानी के जखाइर मैदान में तब्दील हो गये थे आज फिर उनमें पानी की लहरें हिलोरे मार रही हैं। इन्हीं किताबों को पढ़कर कश्मीर से कन्याकुमारी तक आम से लेकर खास लोगों ने पानी बचाने का अज्म तो लिया ही कुओं और तालाबों को दोबारा जिन्दा करने की मुहिम छेड़ दी है। इस मुहिम के बेहद मुफीद असरात और नतीजे बार–बार खुशहाली और तरक्की की शक्ल में मुल्क के कई शहरों में लगातार जाहिर हो रहे हैं। इसलिए मैने जरूरी समझा कि ऐसी किताबों को मुस्लिम मआशरे के लोग या उर्दू के जानकार भी पढ़ें ताकि उनमें भी पानी के दम तोड़ते वसाइल को दोबारा जिन्दा करने का शोक और जज्बा पैदा हो।

पानी बचाने की पुरानी तहजीब के सहारे हम अपने मुल्क को किस तरह खुशहाल, खुदकफील बनाकर मजबूर मआशरे को दोबारा मजबूत बना सकते हैं इसकी पुरअसर पेशकश का रास्ता ताती अनुपम मिश्र की ये दो किताबे आज भी खरे है तालाब और गोचर का प्रसाद बांटता लापौड़िया का क्योंकि कई हिन्दोस्तानी और बेरूनी जबानों में तरजुमा हो चुका है और उर्दू में इसका तरजुमा करने की हिदायत अल्लाह ने मुझ अता फरमाई है इसलिए में इस नेक कारेखैर की बदौलत अल्लाह से दुआ करता हूं कि इसे पढ़कर मेरे मआशरे में भी अल्लाह की इस बेशकीमती नेमत को बचाने का जज्बा हर एक मुसलमान मे पैदा हो ताकि आने वाली नस्लें इससे फैजयाब हों। मुझे उम्मीद है कि किताब पढ़कर पानी बचाने ओर दम तोड़ते कुए,तालाबों को नई शक्ल देने के काम की और मुसलमान भी रागिब हांगे। मैने इस किताब में कुछ दूसरे लोगों के आर्टिकल्स का भी तर्जुमा किया है। जिन्होने अपने कलम से पानी बचाने की नई रोशनी दिखाने की कोशिश की है। मुझे उम्मीद है मेरी ये कोशिश जिसे मैने पानी और हम का नाम दिया है लोगों में जरूर बेदारी पैदा कर अपने मकसद में कामयाब होगी। में सबसे पहले इस किताब के तखलीककार जनाब अनुपम मिश्र का तहेदिल से मशकूर और ममनून हूं जिन्होने मुझे इसका उर्दू तर्जुमा करने की बेहिचक इजाजत दी। हरियाणा के मेरे दोस्त सुरेन्द्र बांसल जिन्होने इस किताब का पंजाबी में तर्जुमा किया है और भोपाल के कवि तथा कथाकार जनाब ध्रुव शुक्ल का भी

शुक्रगुजार हूं जिन्होने मुझे इस काम को अंजाम देने के लिए हर दम मेरा साथ दिया और जिनकी वजह से ही यह काम हो सका। मेरी इस मेहनत में डयरेक्ट्रेट आफ पब्लिक रिलेशन के सेक्रेट्री जनाब मनोज श्रीवास्तव भी शामिल है। जिन्होने इस किताब को पढ़ा है और उसके पुरअसर अंदाजेबयां को सराहा है।

में उनकी हरकदम पर की गई मदद का शुक्रगुजार हूं। इसी तरह इस महकमें के एडीशनल डयरेक्टर जनाब एनके तिवारी और जनाब लाजपत आहूजा साहब का भी मशकूर और ममनून हूं जिन्होने मुझे इस मंजिल तक पहुंचाने का रास्ता दिखाया। मेरे इस काम में मशहूर सहाफी जनाब रामअधीर और जनाब ओमप्रकाश कुन्द्रा ने भी मुझे काफी मदद की है।

मुझे उम्मीद है कि अपने मकसद में मेरी यह कोशिश कामयाब होगी और हिन्दोस्तान के बो बहुत सारे कुंऐ और तालाब जो अपनी बदहाली से जार–जार हो तबाही की शक्ल इख्तियार कर चुके हैं दोबारा पानी के कीमती जखाइर से लबरेज हो कर इस सरजमीं पर खुशहाली का नया पैमाग लिखेंगे और न सिर्फ इस तरह पीने के पानी की किल्लत दूर होगी, खेती–बाड़ी और चरिन्द–परिन्द भी हमारे जरिये बचाई गई खुदा की इस नेमत से फैजयाब हो सकेंगे।

1.1. 2007 भोपाल (म.प्र)

शब्बीर कादरी
एडीटर
हिन्दी माहनामा नेचर टुडे
11, गली कल्लोबुआ, रेतघाट, भोपाल 462001
फोन :– 2530300

URDU TRANSLATION

BY

SHABBIR QADRI

THE BOOKS OF

NOTED ENVIRONMENTALIST

ANUPAM MISHRA

AAJ BHI KHARE HAIN TALAB

&

GOCHAR KA PRASAD BAANT TA LAPODIA

AS

PAANI AUR HUM

PRICE- RS.250/-
FOR INDIVIDUAL RS.125/- ONLY

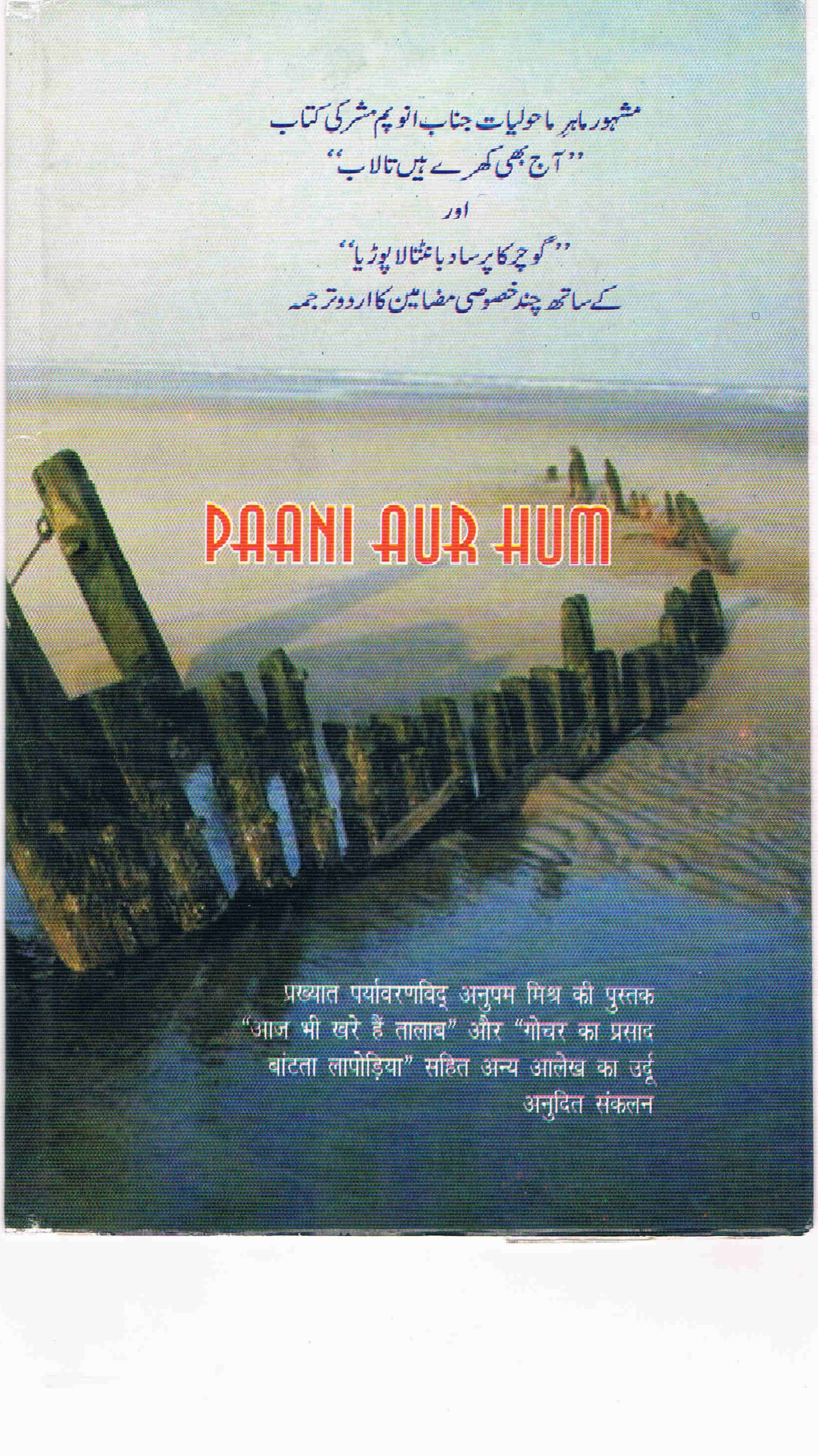
مشہور ماہرِ ماحولیات جناب انوپم مشر کی کتاب
''آج بھی کھرے ہیں تالاب''
اور
''گوچر کا پرساد بانٹتا لاپوڑیا''
کے ساتھ چند خصوصی مضامین کا اردو ترجمہ
PAANI AUR HUM
प्रख्यात पर्यावरणविद् अनुपम मिश्र की पुस्तक
"आज भी खरे हैं तालाब" और "गोचर का प्रसाद
बांटता लापोड़िया" सहित अन्य आलेख का उर्दू
अनुदित संकलन